68

UNIVERSITY LIBRARY
27 JUL 1948
ALLAHABAD

نگار

نگار

UNIVERSITY LIBRARY
27 JUL 1948
ALLAHABAD

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

[illegible] [illegible]

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انشائیوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ اس میں اکثر بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے کئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہوں۔ مجلد نہایت عمدہ طباعت و کاغذ اور نفیس گردپوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز (دو حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۲ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین ر[illegible]

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی بار سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی حیثیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دینے کا بڑا سبب بنے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت سے بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

یتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

الب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم

پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

رقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپکی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

ضرو

نہ فیکٹری - ۱۸۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

شمارہ ۱
ایم۔ اے۔ ۳
فی رضوی۔ ۷
۵۵
۴۰
۶۳
ست زبان اور
میں سحر حلال
کاغذ پر حضرت نیاز
شں کے۔
رت نیاز نے جوش
یان اور فن عروض
یات معلوم کر جاتے
دو روپیہ
کتابیں
ئیں گے

نگار بک ایجنسی کی جدید مطبوعات

مکتوبات نیاز (تیسرا حصہ) - انشاء لطیف، انتقادات عالیہ، ندرت بیان، سلاست زبان اور اردو فارسی اشعار کا وہ بیش قیمت ذخیرہ جو دنیائے ادب میں سحر حلال اور معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے - ۲۸ پونڈ کے دبیز اور چکنے کاغذ پر - حضرت نیاز کی تصویر کے ساتھ خوشنما جلد میں معہ دو رنگ کے گرد پوش کے۔

قیمت علاوہ محصول چار روپیہ

مالہ و ماعلیہ - دور حاضر کے بعض اکابر شعراء کے کلام کا خورد بینی مطالعہ، جس میں حضرت نیاز نے جوش، سیماب، جگر، ماہر اور وحشت وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر معنی و بیان اور فن عروض کے نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے - وہ حضرات جو معیاری شاعری کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے - قیمت علاوہ محصول دو روپیہ

گوہر (زیر طبع) نظیر جمیلی ام-اے کا ناول جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ زن و شو کی عمر کا تفاوت کتنے خراب نتائج پیدا کرتا ہے اور سماج کا یہ رواج کہ محض مروت یا دولت کی لالچ میں کسی کمسن لڑکی کو معمر شخص سے بیاہ دیا جائے کتنا بڑا ظلم ہے۔ ناول اپنی زبان، پلاٹ اور جذبات کے لحاظ سے موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور اس کی خوبی کی ضمانت یہی ہے کہ اسے نگار بک ایجنسی نے شایع کیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

ناول کیا ہے (زیر طبع) یہ کتاب ام-اے، پی، ایچ، ڈی اور ڈاکٹر نور الحسن ایچ ڈی اساتذۂ لکھنؤ یونیورسٹی کی متحدہ کو[illegible] جس میں ناول کی تشکیل، اس کے عناصر ترکیبی [illegible] اہمیت، کردار و پلاٹ کی تقسیم اور اسکے محاسن ناول نویسی کی تاریخ اور اسکے حال و مستقبل پر نہایت [illegible] میں اظہار خیال کیا گیا ہے - اگر آپ کسی ناول کے [illegible] اسکے حسن و قبح کو سمجھنا چاہتے ہیں یا خود کامیاب ناول [illegible] ہیں تو اس کا مطالعہ ضروری ہے - قیمت دو [illegible]

قول فیصل (زیر طبع) - حضرت علی اختر اختر حید[illegible] معرکۃ الآرا نظم جس میں شاعر و شیطان کو ایک دوسرے کا [illegible] کائنات کے خیر و شر، مذہب و اخلاق کی ضرورت اور فلس[illegible] بحث کرتے ہوئے خدا اور اس کی حقیقت پر نہایت حکیمانہ اند[illegible] روشنی ڈالی گئی ہے - حضرت اختر اسوقت ہندوستان کے تنہا [illegible] شاعر ہیں، جو پختگی کلام، علوئے فکر اور خیالات کی گہرائی کے لحاظ [illegible] جواب نہیں رکھتے۔ ایک ایک شعر موتی کی لڑی ہے اور اسکا ہر لفظ جڑا ہوا نگ[illegible] یہ نظم ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ [illegible] کے دبیز کاغذ پر معہ رنگین گرد پوش کے شایع ہو رہی ہے۔ حضرت اختر کی ان کی تصویر بھی اس میں شامل ہے - قیمت [illegible]

ضروری نوٹ

مکتوبات نیاز اور مالہ و ماعلیہ دونوں طیار ہیں اور ان کی روانگی شروع ہو گ[illegible]

نگار کا آیندہ سالنامہ

فسانہ نمبر ہوگا

مفصل اعلان آیندہ مہینے شایع ہوگا

جلد ۵۴	فہرست مضامین جولائی سنہ ۴۸ء	شمار ۱

ملاحظات ---------- ۴
غالب جنت میں ------- سراج احمد ------ ۹
تیسری لڑائی کے بادل ... بھائی این۔ اے جناح ام اے ۔ ۲۲
میرزا جانجاناں مظہر ..... مالک رام ام۔ اے ---- ۲۸
آنسو ---- ست پرکاش سنگر ایم۔ اے ---- ۳۵
رتن ناتھ سرشار ..... میر محمود علی بادشاہ۔ ایم۔ اے ۔ ۴۳
ترقی پسند ادب کی ایک جھلک .... سید محمد مجتبیٰ رضوی ۔ ۴۷
باب المراسلہ والمناظرہ ---- اسحاق محمد ---- ۵۵
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۰
اشتہار ---------- ۶۳

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پر زور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنوں میں **انجیلِ انسانیت** کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے

حجم ۷۰۲ صفحات ۔ کاغذ سفید و دبیز ۔ جلد خوشنما ۔

قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے (عہ)

مکتوبات نیاز (تیسرا حصہ)

انشاء لطیف، انتقاداتِ عالیہ، نُدرتِ بیان، سلاستِ زبان اور اُردو فارسی اشعار کا وہ بے مثل ذخیرہ جو دنیائے ادب میں سحرِ حلال اور معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۲۰ پونڈ کے دبیز اور چکنے کاغذ پر حضرت نیاز کی تصویر کے ساتھ، خوشنما جلد میں معہ دو رنگ کے گرد پوش کے۔

قیمت علاوہ محصول چار روپیہ

مالہ و ماعلیہ

دورِ حاضر کے بعض اکابر شعراء کے کلام کا خوردبینی مطالعہ جس میں حضرت نیاز نے جوش، سیماب، بگر، ناہر اور وحشت وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھکر معنی، بیان اور فنِ عروض کے نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔ وہ حضرات جو معیاری شاعری کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اسکا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔

ضروری نوٹ مکتوبات نیاز اور مالہ و ماعلیہ دونوں طیار ہیں اور ان کی روانگی شروع ہوگئی ہے۔ جو حضرات یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کریں گے اُن سے چھ روپیہ کی جگہ معہ محصول ڈاک صرف پانچ روپیہ لئے جائیں گے۔

سالانہ چندہ: چھ روپیہ ہندوستان کے لئے
بیرونِ ہند کے لئے بارہ روپیہ

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد (۵۴)	جولائی سنہ ۱۹۴۸ء	شمار (۱)

ملاحظات

قومی نظریہ اور قول و عمل کا اختلاف

مسلم لیگ کے دورانِ قیام ہی میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آگیا تھا کہ ہندو مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہیں یا دو مختلف قوموں کے اور اسپر کافی بحث بھی ہو چکی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تقسیمِ ہند کے بعد اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس مسئلہ پر غور کرنا ہر شخص کا فرض ہو گیا ہے، کیونکہ ہندوستان کا سیاسی مستقبل بہت کچھ اسی مسئلہ کے طے ہونے پر منحصر ہے۔

(وہ لوگ جو تقسیمِ ہند کے مخالف تھے ان میں نمایاں عنصر اہل کانگرس کا تھا اور جو حضرات تقسیم کو ضروری سمجھتے تھے، وہ زیادہ تر مسلم لیگ سے تعلق و ہمدردی رکھتے تھے، اربابِ کانگرس کا کہنا یہ تھا کہ ہندو مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہیں، اس لئے تقسیمِ ہند کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور اربابِ لیگ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کی قوم ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے اس لئے ان کی حکومت اس سرزمین میں جہاں ان کی اکثریت ہے علحدہ ہونا چاہئے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگرس کا یہ نظریہ کہ ہندو مسلم دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور ان دونوں کو مل جل کر رہنا چاہئے بڑا بلند نظریہ ہے، لیکن دنیا میں محض نظریوں سے کام نہیں چلتا اصل چیز اس پر عمل ہے اور اسی پر ہمیں غور کرنا ہے لیکن آئیے سب سے پہلے "قوم و قومیت" کے صحیح مفہوم اور اس کی ہیئت و ترکیب پر غور کریں۔

قوم سے مراد انسانوں کی وہ جماعت ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے جذبات سمجھ کر اور ان کو ٹھیس پہونچائے بغیر امن و سکون، صلح و آشتی کی زندگی بسر کر سکیں اور جب پاس بیٹھیں تو احساسِ احتراز و مغایرت ان میں نہ پایا جائے۔

اس مفہوم کے پیشِ نظر جب ہم اتحادِ قومی کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے کئی چیزیں آتی ہیں: نسل، ملک و وطن، مذہب، ثقافت، زبان اور سیاسی نقطۂ نظر اور اگر کسی جماعت کے افراد ان پانچوں باتوں میں مشترک ہوں گے تو یقیناً وہ بڑی زبردست

متحدہ قومیت کے افراد کہلائیں گے جس کی مثالیں ہم کو مغرب کے بعض ملکوں میں ملتی ہیں لیکن چونکہ عہدِ حاضر کی متمدن دنیا میں بین الاقوامی تعلقات بہت وسیع ہو گئے ہیں اور کمزور سے کمزور رشتۂ اتحاد سے بھی کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلئے ہم کو غور کرنا ہوگا کہ متحدہ قومیت کے لئے کم از کم کن باتوں میں اشتراک ضروری ہے اور کن کن باتوں کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نسل سے میری مراد وہی ہے جسے انگریزی میں Race کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ایک ہی نسل کے لوگ مختلف ملکوں میں جاکر اور مختلف زبان اور مختلف معاشرت و مذہب اختیار کرکے ایک دوسرے سے بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں اس لئے قومیت کے لئے نسل کا اتحاد ضروری نہیں۔ مثلاً وسط ایشیا اور چین و جاپان کی آبادی کو لیجئے کہ نسلاً سب مغل ہے، لیکن ترکستان کا باشندہ خدوخال کی مشابہت کے سوا، جاپانی یا چینی انسان سے بالکل مختلف ہے اور اب دونوں مختلف قومیت رکھتے ہیں۔

(۲) مذہب اس میں شک نہیں بڑا قوی ذریعہ اتحاد کا ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایک ہی مذہب کی دو جماعتوں میں ملکی و سیاسی اغراض کی بناء پر سخت لڑائیاں ہوئی ہیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔

(۳) ثقافت (کلچر) بھی آپس کے میل جول کے لئے بڑی ضروری چیز ہے اور جن جماعتوں کا کلچر ایک سا ہے، ان میں آسانی کے ساتھ اشتراک عمل پیدا ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان میں کبھی اختلاف و تضاد نہ ہو۔ ایک ہی کلچر رکھنے والی قوموں میں اکثر جنگ ہوئی ہے۔

(۴) زبان کا اشتراک بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو کلچر کا اشتراک، لیکن ہمزبان ہونا اس کا ضامن نہیں کہ آپس میں جنگ نہ ہو۔

چین و جاپان کی لڑائی، چین کی خانہ جنگی، یوروپ کی لڑائیاں، یہ سب اس امر کی شاہد ہیں کہ زبان و کلچر، مذہب وطن کا اشتراک کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک قوم کے افراد میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

(۵) ملک و وطن کا تعلق بڑا گہرا تعلق ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک سرزمین کی رہنے والی تمام جماعتیں ایک ہی قوم کہلائیں۔ اگر کسی ملک کے باشندوں میں کچھ جماعتیں ایسی ہیں جو بہ لحاظ زبان، مذہب و کلچر ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو وہ قومیت کے لحاظ سے یقیناً علحدہ علحدہ ہوں گی، لیکن یہ اختلاف اتحاد کا منافی نہیں۔

الغرض مذہب، وطن، کلچر، ثقافت، زبان اپنی اپنی جگہ متحدہ قومیت پیدا کرنے میں معاون ضرور ہیں، لیکن اگر متحدہ قومیت کا سوال اس لئے اُٹھایا جاتا ہے کہ وہ قیام امن و سکون کی ضامن ہے تو غلطی ہے، کیونکہ ایک ملک میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے سب سے اہم و ضروری سیاسی عقاید کا اتحاد ہے۔ اگر ایک ہی قوم کے افراد میں (خواہ وہ مذہب و زبان، کلچر و وطنیت کے لحاظ سے ایک ہی کیوں نہ ہوں) سیاسی اختلاف ہوگا تو امن خطرہ میں رہے گا اور اگر ایک ملک کی مختلف جماعتوں کا (خواہ ان میں کلچر، مذہب، زبان و معاشرت میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو) سیاسی نقطۂ نظر ایک ہوگا تو پھر

جامعیت کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اگر ارباب کانگرس، ہندو مسلمانوں کی متحدہ قومیت کے قایل ہیں تو ان کی دلیل زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں جماعتیں ایک ہی ملک کی رہنے والی ہیں اس لئے ان دونوں کو ملکر رہنا چاہئے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، محض وطنی تعلق اتحاد کا ضامن نہیں۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب، معاشرت اور کلچر کے لحاظ سے ہندو مسلمانوں میں بہت اختلاف ہے اور یہ اختلاف اب نہیں بلکہ ہمیشہ سے رہا ہے، لیکن باوجود اس کے ان دونوں جماعتوں کے افراد اب سے ۳۰، ۴۰ سال قبل مل جل کر رہتے تھے اور باہمی تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ پھر اس کا سبب یہ نہ تھا کہ دونوں کی قومیت ایک تھی، بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ان کے سیاسی عقاید میں کوئی اختلاف نہ تھا، دونوں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس حال میں خوش تھے۔

اس کے بعد جب ملک میں سیاسی بیداری شروع ہوئی اور آزادی کا جذبہ لوگوں میں پیدا ہوا تو اس جذبہ نے دونوں جماعتوں کو دو مختلف زاویوں سے متاثر کیا، ایک طرف ہندوؤں میں یہ احساس پیدا ہوا (اور قدرتاً پیدا ہونا چاہئے تھا) کہ ملک اُن کا ہے اور انھیں کو اقتدار حاصل ہونا چاہئے، دوسری طرف مسلمان (جنھوں نے اپنی غلطی و حماقت سے ہندوستان کو کبھی اپنا اصلی وطن نہیں سمجھا) خایف ہوئے کہ اگر ملک آزاد ہوا تو ہندو اکثریت اُن کے مذہب، زبان اور کلچر کو ختم کر دیگی، اس لئے جماعتی حقوق کی حفاظت کا اقتضا یہ ہے کہ اُن کی حکومت ہندوؤں سے علحدہ قایم ہو۔

یہ بالکل واقعہ ہے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ہمیشہ سے یہی تھی کہ وہ ہندو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرے، اور وہ اس میں کامیاب ہوئی، لیکن بایں ہمہ یہ کہنا انصاف کے خلاف ہوگا کہ کانگرس کا قیام برطانوی حکومت کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا۔

کانگرس نے کبھی مذہب و قوم کی تفریق نہیں کی اور اس کا دروازہ ہندوستان کے ہر باشندہ کے لئے کھلا ہوا تھا چنانچہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا، جب مسلمانوں نے کانگرس میں بہت پرجوش حصہ لیا، اور اگر باہمد گر بدگمانیاں پیدا نہ ہو جاتیں تو اسوقت ہندوستان کی سیاست و تشکیل حکومت کچھ اور ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ کچھ تو بعض ہندوؤں کی غلطی سے اور کچھ خود اپنی کم ہمتی سے، مسلمان کانگرس سے علحدہ ہونے لگے اور مسلم لیگ قایم کر کے انھوں نے اپنا سیاسی نقطۂ نظر جداگانہ قایم کیا۔ پھر چونکہ مسلم لیگ کی بنیاد کسی ٹھوس حقیقت پر قایم نہ تھی، اس لئے وہ کوئی خاص اہمیت نہ حاصل کر سکی اور چند دن کے بعد تقریباً فنا ہو گئی، لیکن کچھ زمانہ بعد جب صوبوں میں کانگرس حکومت قایم ہوئی تو ان میں عنصر غالب مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والوں کا تھا اور انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کی ذہنیت میں ایسا تیز ردِ عمل پیدا کیا کہ مسلم لیگ دوبارہ زندہ ہو گئی اور پھر باہمی اختلافات برابر بڑھتے ہی رہے، یہاں تک کہ آخر کار ہندوستان کو تقسیم ہونا ہی پڑا اور متحدہ قومیت کا وہ اصول ثقافت، زبان اور سب سے بڑی حامی کانگرس تھی متزلزل ہو گیا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس تفریق میں غلطی سراسر مسلمانوں کی تھی اور ہندوؤں پر اس کی

ذمہ داری بالکل عاید نہیں ہوتی، ہماری رائے میں صحیح نہیں۔

یہ دعویٰ کہ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ تر ہندوؤں ہی کا تھا، لیکن اس دعویٰ کی تصدیق انھوں نے اپنے عمل سے نہیں کی۔ یہ نہ صرف انسانیت و اخلاق بلکہ سیاست اور ڈپلومیسی کا بھی تقاضا تھا کہ غالب جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے ساتھ بلند نظری سے کام لیتے رواداری برتتے اور اپنے طرزِ عمل سے یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ انھیں اپنے سے علٰحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آزادیٔ ہند سے قبل بھی جب صوبوں میں کانگریسی حکومت قایم ہوئی تو انھوں نے اپنی بلند نظری کا ثبوت نہیں دیا اور زبان کے مسئلہ میں اپنے عمل سے نیشنلسٹ مسلمانوں کو بھی اپنی طرف سے بددل بنادیا اور اب تقسیم ہند کے بعد تو خیر جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، سبھی کو معلوم ہے۔

اگر ہندو، مسلمانوں کی قومی حیثیت جداگانہ تسلیم کر لیتے، تو شاید ہمیں یا کسی مسلمان کو شکایت کا موقعہ نہ تھا، لیکن ایک طرف تو ان کو یہ اصرار کہ ہندو مسلم ایک ہی قوم کے فرد ہیں اور دوسری طرف عمل یہ کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان روز ایک نئی دیوار حایل کی جارہی ہے۔

سب سے بڑی چیز جو ہندو مسلمان دونوں کو متحد کر سکتی ہے زبان ہے، اور یہی وہ نکتہ تھا جس کے پیش نظر مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کے رواج اور اُردو ہندی دونوں رسم خط قایم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور دفتروں، مدرسوں اور عدالتوں میں ہندی زبان و رسم خط قایم کر کے مسلمانوں کی توقعات کو سخت صدمہ پہونچایا، اسی کے ساتھ ملازمت میں ۳۳ فی صدی کی نسبت گھٹا کر ۱۴ فی صدی کر دی گئی، جو کسی طرح قرینِ انصاف نہ تھی، کیونکہ ۸۴ فی صدی ہندو آبادی میں عنصرِ غالب کاشتکاروں اور اچھوت قوموں کا ہے اور ۱۴ فی صد مسلم آبادی میں اکثر حصہ اس چھٹی ہوئی منتخب آبادی کا ہے جو ذہنی حیثیت سے نہ کاشتکار طبقہ سے تعلق رکھتی ہے نہ اچھوتوں سے بلکہ اس طبقہ کا مماثل ہے جسے ہندوؤں کا تعلیم یافتہ نوکری پیشہ طبقہ کہا جاتا ہے اور اگر ان دونوں کو سامنے رکھا جائے تو مقابلتاً مسلم آبادی کسی طرح ۳۳ فی صدی سے کم نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اہم ذمہ دارانہ خدمات سے ہٹایا جارہا ہے اور ان کی جگہ ایسے ہندو افسران کو دی جارہی ہے جن میں سے اکثر مہا سبھائی ذہنیت کے ہیں، تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ طرزِ عمل اسی حکومت کا ہے جو اپنے آپ کو غیر مذہبی کہتی ہے اور مسلمانوں کو بھی اپنی ہی قوم کا جزو بتاتی ہے۔

اگر انڈین یونین واقعی دو قومی نظریہ کو غلط سمجھتی ہے اور وہ صدق و خلوص کے ساتھ چاہتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پھر دونوں ایک ہو جائیں، تو کیا اس کا طرزِ عمل یہی ہونا چاہئے، کیا مسلمانوں کے جذبات خودداری کے ساتھ اسے اسی طرح کھیلنا چاہئے، ہندو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہب و ثقافت، زبان و معاشرت سب کے لحاظ سے مسلمانوں کی جماعت ان سے مختلف ہے اور اگر ان دونوں میں اتحاد قایم ہو سکتا ہے تو صرف سیاسی نقطۂ نظر سے

اور میرا نقطہ نظر صرف یہی ہو سکتا ہے کہ "ہندوستان" ترقی کر کے دُنیا کی بڑی سی بڑی قوت بن جائے جس کے لئے ناقابلِ تقسیم وحدت بالکل ضروری ہے۔

میں نے ہمیشہ تقسیم ہند کی مخالفت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ قیام پاکستان نے بہ حیثیت مجموعی یقیناً مسلمانوں کو بہت نقصان پہونچایا ہے جس کا اظہار میں اس سے قبل بارہا کر چکا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ میں اس کا بھی قایل نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد انڈین یونین نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، وہ اس کے شایانِ شان تھا۔ اگر اس نے اُصول تقسیم کو تسلیم کر لیا تھا تو اس پر عمل نہایت خوشدلی سے کرنا چاہئے تھا اور اگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی سبب ناخوشگواری کا پیدا بھی ہوا تھا، تو اسے ہنس کر ٹال دینا چاہئے تھا اور اپنے اخلاق سے اس کو متاثر کرنا چاہئے تھا کیونکہ اصل قوت وجرأت اسی کا نام ہے اور ایک قوی فریق، کمزور فریق کو اسی بلند نظری سے اپنا سچا دوست بنا سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ پاکستان کی تمام ہندو آبادی کسی وقت پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلی آئے، لیکن انڈین یونین کے کروروں مسلمان سب کے سب پاکستان چلے جائیں بالکل ناممکن ہے۔ اس لئے جمہوری حکومت کے امتحان سے حقیقتاً انڈین یونین ہی کو گزرنا ہے، اور قطع نظر اس سے کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، اس کو عملی حیثیت سے یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ واقعی غیر مذہبی اور غیر طبقاتی حکومت ہے۔ لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں کہ انڈین یونین کے مسلمانوں کی وفاداری کو مشتبہ سمجھ کر وہ تو بار بار اس کا امتحان لے اور خود اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں میں جذبۂ اعتماد و وفاداری قایم نہ ہونے دے۔ اگر ہم کسی کے حقوق یا اس کے جذبۂ خودداری کا خیال نہیں کرتے تو ہم کو کیا حق حاصل ہے اس سے انقیاد واطاعت کی توقع کریں اور اگر سوال صرف زعم قوت کا ہے تو پھر جمہوریت کا نام کیوں لیا جائے۔

بہر حال تقسیم ہند کے بعد انڈین یونین کی حکومت جو رنگ اختیار کر رہی ہے، وہ مسلمانوں کے لئے امید افزا نہیں ہے اور ہندو اکابر کو سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں کے جذبات پامال کرنے کے بعد انھوں نے ہندوستان پر حکومت کی بھی تو اس سے انھیں کیا سچی خوشی حاصل ہو سکتی ہے اور اخلاق و انسانیت کی دُنیا میں ان کی کیا ساکھ باقی رہ سکتی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد بھی بعض ہندو اکابر نے یہی امید قایم کی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دو روٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح ایک نہ ایک دن پھر مل جائیں گے اور یقیناً اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی لیکن ان کا طرزِ عمل اس کے منافی ہے، کیونکہ ایک طرف وہ دو قومی نظریہ کو بھی غلط بتاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے عمل سے یہ بھی ثابت کرتے جاتے ہیں کہ ہندو قوم، مسلمانوں سے بالکل جدا قوم ہے اور اس طرح آیندہ اگر یہ ملنا چاہیں بھی تو نہیں مل سکتے۔

مکتوبات نیاز حصہ سوم اور ما لہ و ما علیہ

طیار ہیں

دونوں کی قیمت علاوہ محصول چھ روپیہ ــــ لیکن دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف پانچ روپیہ۔

غالب جنت میں

پہلا سین

(غالب کی موت)

پس منظر :- ایک سہ درہ دالان ہے، جس کے سامنے ایک بڑا صحن ہے۔ دالان کے دروں میں اندرونی جانب پردے آدھی محراب تک بندھے ہوئے ہیں۔ دالان کے وسط میں ایک پلنگ ہے جس کا سرہانا شمال کی سمت ہے پلنگ پر گدا بچھا ہوا ہے اور سفید چادر چاروں طرف کلابتون کی ڈوریوں سے پایوں میں بندھی ہوئی ہے۔ پلنگ سے ملا ہوا تختوں کا چوکا ہے جس پر دری بچھی ہوئی ہو اور اس پر صاف فرش ہے جو چاروں کونوں پر میر فرشوں سے دبا ہے۔ صدر میں بڑا گاؤ تکیہ قرینے سے رکھا ہے۔ سامنے سادہ اُگالدان رکھا ہے۔ اُگالدان سے کچھ اوپر پلنگ سے نزدیک خاصدان رکھا ہے پلنگ سے قریب تخت پر ایک لکڑی کا سربند قلمدان رکھا ہے، جس کے اوپر بہت نفیس تارکا کام کیا ہوا ہے، ایک کاغذ گیر میں خط لکھنے کا کاغذ دبا ہوا پاس ہی رکھا ہے۔

پلنگ کے داہنے جانب کچھ پرانے قسم کے مونڈھے رکھے ہوئے ہیں جن پر حالی، شیفتہ، حکیم احسن اللہ خاں ثاقب نواب ضیاء الدین احمد خاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ غالب پلنگ پر عمدہ چھینٹ کی رضائی اوڑھے لیٹے ہیں۔ دونوں گھٹنے کھڑے ہیں۔ پورا جسم ڈھکا ہے صرف چہرہ کھلا ہے۔ آنکھیں نیم وا ہیں۔ بے ہوشی کی سی کیفیت ہے۔ حلق سے خرخر کی آواز برابر آرہی ہے۔ سرہانے ایک نوکر چارخانے کا بڑا رومال لئے مکھیاں جھل رہا ہے۔

یکایک زور کی خرخر کے ساتھ غالب چونکتے ہیں اور آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ حالی نے آگے بڑھ کر ایک پرچہ پیش کیا۔ نواب علاء الدین خاں لوہارو کا خط استفسار حال و طلب خیریت کا تھا۔ کاغذ کچھ دیر سامنے کئے رہے بے نور آنکھوں نے صفحہ کو دیکھا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ زور سے کھنکارا، ذرا گردن اُٹھائی۔ احسن اللہ خاں کی طرف دیکھا۔ وہ اُٹھ کر تخت پر آئے کاغذ گیر سے کاغذ نکالا۔ قلم دان سے کلک کا قلم نکالا۔ انگوٹھے پر اس کا قط جانچا اور گھٹنے پر کاغذ رکھ کر لکھنے کے لئے طیار ہو گئے۔ غالب نحیف آواز میں بولے۔ لکھو:

"مرزا مولائی — گمان زیست بود برمنت ز بے دادی   بدست مرگ و لے بدتر از گمان تو نیست

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو - ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا - نہ کردہ ہجر مدارا بہ من سر تو سلامت،
از کار رفتہ و درماندہ ہوں - (رک کر) یہ مصرعہ چپکے چپکے پڑھتا ہوں - "اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے ؟"
مرگ کا طالب غالب - (رک کر) مُہر کر کے بھیج دو"

پھر غفلت طاری ہو جاتی ہے - سب لوگ خاموش ہو جاتے ہیں - احسن اللہ خاں قلمدان سے مہر نکال کر ثبت کرتے ہیں اور خط کو ملفوف کرتے ہیں - غالب کے ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں - لیکن کچھ سُنائی نہیں دیتا ہے - (ایک فرشتہ بائیں جانب آ کھڑا ہوتا ہے، جسے صرف غالب دیکھ رہے ہیں)

فرشتۂ اجل :- "کیا واقعی آپ کو میرا انتظار ہے ؟"

غالب : "ہاں، کیا تم مجھے لینے آئے ہو ؟"

فرشتہ : (ہنسی کو ان سنی کرتے ہوئے) "مگر آپ جینے سے اس قدر کیوں بیزار ہیں ؟"

غالب : "میری تمام عمر حسرت و ناکامی میں گزری، ہمیشہ ہم چشموں کی سیر چشمی پر گزارا ہوتا رہا - دل کے تمام حوصلے دل کے دل ہی میں رہ گئے - نہ کمال کی قدر ہوئی نہ ہنر کی پذیرائی - پھر بھی تم کہتے ہو کہ جینے سے بیزار کیوں ہوں"

فرشتہ : "تو آپ چلنے کے لئے طیار ہیں ؟ مگر کیا آپ کو اپنی نئی زندگی میں کچھ بہتری کی امید ہے ؟"

غالب : (آہ کر کے) "عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
میری بےچینی کا یہی تو باعث ہے - میں چلنے کے لئے بالکل تیار ہوں"

فرشتہ : "بہت اچھا چلئے"

یہ آہستہ سے غالب کے قلب پر انگشت شہادت رکھتا ہے، غالب ایک آہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتے ہیں - حالی آگے بڑھ کر اشاروں میں مزاج پرسی کرتے ہیں -

غالب : (نحیف آواز میں) — دم واپسیں بر سرِ راہ ہے ٭ بس اب یارو اللہ ہی اللہ ہے، (ہچکی)

پیشانی پر پسینے کی بوندیں نظر آنے لگتی ہیں - چہرے پر مُردنی چھا جاتی ہے - شیفتہ جلدی سے اُٹھ کر شربت انار کا چمچہ حلق میں ٹپکاتے ہیں روح پرواز کر جاتی ہے، سب لوگوں پر سکوت طاری ہو جاتا ہے - نوکر آنکھیں اور منھ بند کر کے چادر اُڑھا دیتا ہے

دوسرا اسین

غالب قبر میں

پس منظر :- ایک فراخ بغلی قبر ہے - غالب، کفن میں لپٹے پڑے ہیں، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے - یکایک ایک سوراخ سے باریک

تیز روشنی کی شعاع داخل ہوتی ہے جس سے پوری قبر میں اُجالا ہو جاتا ہے۔ روشنی میں دو فرشتے غالب کے سرہانے ایک دائیں اور ایک بائیں جانب بیٹھا ہوا نظر آتا ہے، وہ دو زانو بیٹھے ہوئے ہیں اور غالب کے چہرے سے کفن ہٹا کر اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ دونوں فرشتے آہستہ آہستہ بات چیت کرتے ہیں۔"

منکر: "اب انھیں جگانا چاہیے۔"

نکیر: "ہاں، ہاں اس منزل میں انھیں آگے بڑھانا چاہیے۔"

منکر: "مگر یہ ہیں کون؟"

نکیر: "ایں! انھیں نہیں جانتے۔ یہ دہلی کے مشہور و معروف فارسی اور ریختہ کے شاعر و انشاپرداز مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں"

منکر: "کون غالب۔ یہی تو نہیں جو (ہنس کر) اپنے خیال میں ہم لوگوں کو دور رکھنے کے لئے عمر بھر شغل مےخواری فرماتے رہے۔"

نکیر: "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

منکر: "تم کو یاد نہیں۔ انھوں نے ایک شعر کہا تھا جس کے کراماً کاتبین چرچے کیا کرتے تھے:۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

نکیر: "اخاہ - یہی وہ غالب ہیں۔ (متفکر لہجے میں) دیکھیے بارگاہ قدس سے ان کے لئے کیا حکم ہوتا ہے۔"

منکر: "یہ تو کوئی ایسی سنگین تقصیر نہیں ہے۔ شاعرانہ شوخی سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہے؟"

نکیر: "بات یہ ہے کہ گمراہی قریب قریب تمام شعرا کا طرۂ امتیاز ہے وہ تو خیر ہمارے ساتھ ٹھٹول بھی دیکھنا ابھی یہ اور کیا کیا اوٹ پٹانگ جواب دیتے ہیں۔"

منکر: "جو کچھ ہو اب انھیں جگانا چاہیے۔"

نکیر: "اچھا جگاتا ہوں"

(غالب کے کان پاس منھ لیجاتا ہے اور گرجتی ہوئی آواز میں قُم باذن اللہ کہتا ہے)

غالب کی پلکوں میں ہلکی ہلکی حرکت پیدا ہوتی ہے، پھر جھرجھری سی آتی ہے ا۔ ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔

غالب: (فرشتوں کو دیکھ کر) "میں کہاں ہوں؟"

منکر "قبر میں"

غالب "تم کون لوگ ہو؟"

منکر نکیر: "ہم منکر نکیر ہیں"

غالب: (چیں بر جبیں ہو کر) "یہاں بھی آرام سے سونا نہیں ملے گا"

منکر نکیر: "ہم بہ حکم خدا آئے ہیں۔ آپ سے چند سوالات کر کے چلے جائیں گے"

غالب: "بسم اللہ فرمائیے"

(سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن چہرے سے برابر ناگواری کے اثرات نمایاں ہیں)

منکر: (عربی میں) "مَن ربک"

غالب: "میں عربی سے ذرا کم واقف ہوں۔ تورانی الاصل ہوں اور پارسی زبان کا شاعر اور کبھی کبھی احباب کی خاطر ریختہ میں بھی فکر کر لیا کرتا تھا"

نکیر: "دادارِ تو کیست؟"

منکر: "کدام رسول را پیرو بودی"

نکیر: "ایمان چیست۔ نور را از ظلمت چوں شناختی؟"

غالب سوالات کی اس بوچھار سے گھبرا اٹھے اور بولے: "ٹھہرو ٹھہرو۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ میں نے زندگی میں ایک شعر کہا تھا جس پر میرا عقیدہ ہے جو چاہو سمجھ لو:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(منکر نکیر دونوں انگشت بہ دنداں رہ گئے اور سوچنے لگے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ یکایک فضا میں ہلکا ہلکا لحن دوڑنے لگا۔ غالب بھونچکے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن منکر نکیر مودب اور نماز کی سی نیت باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے لحن لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ یکایک ساز خاموش ہو گیا اور ایک پارعب لیکن باریک آواز سنائی دی)

"منکر نکیر۔ تمہارا کام ختم ہو گیا۔ اس بندہ کا جواب تمہارے کانوں کے لئے بالکل نیا ہے۔ لیکن بات اس نے بڑے پتے کی کہی ہے۔ اس پر عذاب قبر کی ضرورت نہیں۔ کراماً کاتبین سے کہو اس کی فرد اعمال اسے سنا دیں تاکہ وہ اپنے گناہوں کی جواب دہی کے لئے طیار ہو جائے"

(منکر نکیر حیرت سے غالب کو دیکھتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں)

تیسرا سین

غالب ملاءِ اعلیٰ کی عدالت میں

پس منظر: ایک بہت وسیع کرہ چاروں طرف بڑے بڑے تارے نظر آرہے ہیں، شمال و جنوب میں دو رویہ سفید

سائے نظر آرہے ہیں ان سایوں کے اختتام پر مشرقی کنارے پر ایک ۵۰-۶۰ برس کا بڈھا۔ پشت خم۔ بدن میں رعشہ لیکن اس عمر میں بھی سُرخ سفید ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا سر جھکائے کھڑا ہے، اس کے یمین ویسار ایک ایک پر دار فرشتہ کاغذ کے پلندے ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا ہے۔ ان کے چہروں سے بیباکی، خود اعتمادی اور طمانیت ظاہر ہو رہی ہے۔ دونوں خاموش جیسے کسی انتظار میں کھڑے ہوں، دفعتاً ہلکی ہلکی لحن کی آواز پیدا ہوتی ہے، تمام سائے سر جھکا دیتے ہیں۔ فرشتے زیادہ کرخت انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے پروں کی سرسراہٹ سے غالب چونک کر سر اُٹھاتے ہیں اور فرشتوں کو دائیں بائیں دیکھ کچھ متحیر سے ہوئے اور بولے ابھی ابھی تو دونوں سے نجات حاصل کی ہے۔ آپ فرمائیے آپ کون ہیں؟

کراما : "ہم کراماً کاتبین ہیں۔ یہ ملاء اعلیٰ ہے۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ تم کو تمہارے ان جرموں کی تفصیل سنا دیں جو تم نے دنیا میں کئے ہیں"

غالب : "بہت خوب آپ بھی اپنے حوصلے نکال لیجئے"

کاتبین : "عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے" یہ ملزم ایشیا کے مشہور و معروف خطۂ ہند کا نامور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ المتخلص بہ غالب معروف بہ مرزا نوشہ ہے۔ آج ہی اس نے دار العمل کو چھوڑا ہے۔ ہم اس کی فرد اعمال لیکر حاضر ہوئے ہیں کہ بارگاہ جلالت میں پیش کریں"۔

ندائے غیبی : "تم کو جو کچھ کہنا ہے کہو اور مجرم کو جواب دہی کا موقعہ دو"

کراما : "احکم الحاکمین! اس کی فرد اعمال عصیاں سے بالکل سیاہ ہے"

ندائے غیبی : "اس کے خلاف خاص خاص الزامات کیا ہیں"

کراماً کاتبین نے اپنے اپنے پلندے کھولے اور یوں گویا ہوئے:-

کراما : "رب الارباب! یہ مجرم عالم ارواح سے ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے لئے عالم آب وگل میں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو اس کے لئے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ پاؤں میں بیڑی ڈالدی گئی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا گیا۔ نظم ونثر معمولی ٹھیرائی گئی۔ مگر یہ گریز پا قیدی جیل خانہ سے بھاگ کر تین سال تک بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار کلکتہ سے پکڑ لایا گیا اور دو ہتکڑیاں اور بڑھا دی گئیں۔ باوجود پاؤں بیڑی سے فگار اور ہاتھ ہتکڑیوں سے زخمدار اور مشقت مقرر ہونے کے اس نے آج ۱۲۸۵ھ تک قلیل مدت میں اپنے جرائم میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ اس کا سب سے سنگین جرم یہ ہے کہ اس بارگاہ قدس میں عمر بھر سر نیاز نہیں جھکایا اور نہ کبھی روزہ رکھا"

ندائے غیبی : "اس الزام کا کوئی ثبوت؟"

کاتبین: "اے دادار جہاں آفریں! اس نے خود اپنے منہ سے غدر کے بعد جب اس کی پنشن بند ہوئی تھی اور دربار میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ پنجاب کی لفٹنٹ کے میر منشی سے یہ کہا تھا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے مجھے باغی مسلمانوں میں کیوں شمار کیا ہے"!

کراماً: تعالیٰ شانک! یہی نہیں۔ عمر بھر قمار بازی کرتا رہا۔ دنیا میں اس کے لئے سزا بھی بھگتی مگر اس فعل سے باز نہ آیا روزہ اس نے کبھی نہ رکھا ماہ صیام میں کوٹھری میں دن بھر بند رہتا اور شطرنج کھیلا کرتا۔ کبھی روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا کبھی دو گھونٹ پانی پی لیا۔ اور اسے روزہ بہلانے سے تعبیر کیا کرتا تھا"!

کاتبین: "جل جلالک! ایک مرتبہ جب بہادر شاہ ظفر نے اس مسئلہ میں اس سے بازپرس کی تو اس نے استہزا کے ساتھ یہ جواب دیکر اسے خاموش کر دیا کہ:

"سامانِ خور و خواب، کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب، کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے لیکن غالب خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

کاتبین یہ کہہ کر رکے تھے کہ غالب نے کراہ کر آہ کی اور گڑگڑا کر بولے:

غالب: "بارالٰہ! ان فرشتوں کی فرد جرم طویل اور میں سال بھر سے بستر پر پڑے پڑے نحیف و زار ہو گیا ہوں، تمام جسم زخمہائے بستر سے فگار ہے اتنی طاقت نہیں کہ کھڑے کھڑے ان کی داستانیں سنوں۔ شاہا، مجھے اجازت مرحمت ہو کہ کہیں بیٹھ ٹیک کر ان کا استغاثہ سنوں"

ندائے غیبی: "اچھا تیرے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ فرش پر بیٹھ جا۔

(ساتھ ہی سدیوں میں حرکت ہوئی ایک نرم قالین غالب کے نیچے بچھا دیا گیا اور ایک گاؤ تکیہ رکھ دیا گیا غالب ایک آہ کے ساتھ تکیہ کا سہارا لیتے اس پر نیم دراز ہو گئے)

ندائے غیبی: "کراماً کاتبین، اس کی فرد جرم میں کچھ اور بیان کرنا باقی ہے یا الزامات ختم ہو گئے"؟

کراماً: "آقائے دو جہاں! یہ تو سمندر سے ایک قطرہ تھا۔ اس کے سیاہ کارناموں کا سلسلہ تو لا متناہی ہے"

ندائے غیبی: "اچھا آگے بڑھو"

کراماً: "اس نے بارگاہ جلالت میں بارہا گستاخی کی ہے۔ اور نہایت بیباکی سے پیش آیا"

ندائے غیبی: "اس الزام کا کوئی ثبوت"

کاتبین: "اس شعر سے بڑھ کر اس کی دریدہ دہنی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے:

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

کراماً: "اس نے قضا و قدر کے انتظامات پر بھی اکثر تمسخر کیا ہے"

ندائے غیبی: "وہ کیونکر"

کاتبین: "ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے، ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے نہ بیل ہے نہ بوٹا مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

کراماً: "اور یا باری تعالیٰ! اس نے قیامت سے بھی انکار کیا ہے (اتنا سنتے ہی غالب ذرا چونکے اور سنبھل کر بیٹھ گئے) اس نے ایک شعر کہا تھا۔ جس سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے:

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں　　شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں"

(غالب جو ذرا چوکنے ہو گئے تھے شعر سنتے ہی پھر اطمینان سے گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے اور چپکے سے "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کر کے خاموش ہو گئے)

کاتبین: "اس کے فردِ جرم میں دوسرا سنگین جرم اس کی شراب سے والہانہ محبت ہے اس نے تمام عمر مےخواری کی۔ کسی روز ناغہ نہیں کیا۔ اکثر رات کو سرخوشی کے عالم میں اس کی طلب شراب بڑھ جاتی تھی۔"

کراماً: "شراب کی اہمیت میں اسے اتنا غلو تھا کہ اس کے ایک دوست نے اس سے تنبیہاً کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اس نے نہایت دریدہ دہنی سے جواب دیا کہ بھائی جسے شراب میسر ہوا۔ اس کو اور کیا چاہئے جس کے لئے دعا کرے"

کاتبین: "خداوندا! یہی نہیں بلکہ اس نے بڑی بڑی بزرگ ہستیوں کو اپنی شراب نوشی کا ٹھیکہ دار قرار دیا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے ساقی کو دھونسنے کی نئی ترکیب نکالی جب اس نے مزید شراب دینے سے انکار کیا تو اسے کہا:

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اور تو اور اسے متبرک اشیاء رہن رکھ کر اور بیچ کر شراب خریدنے میں بھی کوئی باک نہ تھا۔ ایک مرتبہ یہ کہہ کر:-

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے　　مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

اس نے بزرگوں کی یہ میراث بھی پینے کے نذر کر دی۔"

کراماً: "اس نے غضب یہ کیا حضرت ساقیِ کوثر کو ام الخبائث کا ساقی قرار دیکر ان کے اعتماد پر دھڑلے سے پیا کرتا تھا۔ اس نے اس یقین کا کس بلند آہنگی سے اعلان کیا ہے:-

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے　　غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

اس نے دنیا کی شرم و حیا بھی بالائے طاق رکھدی تھی۔ مدہوشی میں اس کا بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ کس جگہ پی رہا ہے اور ظاہری رکھ رکھاؤ کو توڑنے پر فخر کرتا تھا:-

جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

کاتبین : "یاالٰہ العالمین - اس کی مے نوشی کی لت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مے نوشی کے باعث اسکے اعضاء و جوارح نے بالکل جواب دیدیا اور اسکے رعشہ دار ہاتھوں نے جام اُٹھانے سے انکار کر دیا - تو اس نے صرف بوئے مے پر اکتفا کی اور اپنے ملازموں کو حکم دیدیا کہ:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کراما : "اس نے جام نوشی کی وہ ہوا باندھ رکھی تھی کہ میں جب کبھی کسی فرض کی ادائی کے سلسلہ میں سرزمین دہلی سے گزرا تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ جیسے شراب سے متکیف ہوا جا رہا ہوں - اس ظالم شاعر نے یہ کہکر

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

خیال کو حقیقت بنا دیا تھا۔"

(غالب اس تمام روئداد جرائم کے دوران بالکل خاموش تکیہ کے سہارے آنکھیں بند کئے لیٹے رہے اور سوائے دو ایک بار کراہنے کے انھوں نے ایک لفظ نہیں کہا)

کراما کی فہرست الزامات ختم ہوئی تو ندا آئی: "اس کی فرد جرم ختم ہوئی یا ابھی کچھ باقی ہے"

کراما کاتبین: خداوند دو جہاں! اس کی فرد جرم بہت طویل ہے - جس کا صرف ایک حصہ بارگاہ عالی و متعالی میں ہم نے پیش کیا ہم نے اپنی عمر میں ایسا فرد نہیں پایا جسے عصیاں کوشی میں لطف آتا ہو اور جس کا حوصلہ گناہ ہمیشہ بڑھا ہوا ہو اس نے اپنے معاصی کو کبھی اہمیت نہیں دی اور انھیں بہت معمولی درجہ کا سمجھتا رہا۔ اس کی جرأت بیباکانہ ملاحظہ فرمائیں کہتا ہے:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

چوتھا سین

غالب کا جواب

(منظر میں ذرا سا تغیر ہو جاتا ہے - سمت مغرب میں ایک نہایت ٹھنڈی - ہلکی ماورائے بنفشی روشنی افق پر نمایاں ہو جاتی ہے، لحن ذرا تیز ہو جاتا ہے - تمام سائے مع کراما کاتبین کے باادب سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں - ایک شیریں مگر پر اثر لہجے میں آواز آتی ہے)

ندائے غیبی : "غالب! تو سنتا ہے، تیرے خلاف تیرے ہمدم کے ساتھیوں نے کیا کیا زہر اگلا ہے - تیرے پاس ان الزامات کا کیا جواب ہے؟"

غالب اس براہِ راست تخاطب سے کچھ گھبرا سے گئے اور کانپتے کراہتے اُٹھ بیٹھے اور دو زانو بیٹھ گئے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے:

"تو دانا و بینا ہے۔ تجھ سے کچھ پنہاں نہیں ہے۔ ان الزامات کی صحت و عدمِ صحت کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کے بعض اعتراضات کے متعلق اگر اجازت مرحمت ہو تو کچھ عرض کردوں"

ندائے غیبی: "ہمارے حضور میں تجھے ہر طرح کی آزادی ہے تجھے اپنی بریت کے متعلق جو کہنا ہو کہہ"

غالب: عاصی نوازا۔ ترے رحم و الطاف بے پایاں کے صدقے! مجھے سب سے پہلے تو ان کے اس الزام شراب نوشی کے بارہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ انھیں میرے شعروں سے سخت مغالطہ ہوا۔ میں نے جو کچھ کہا زرہ امتثال امر کہا میری نیت ہمیشہ بخیر رہی میں نے دنیائے آب و گل میں ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیا اور اس وقت تیرے حضور میں جہاں صدق و کذب آشکارا ہیں کہتا ہوں کہ:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

میں نے ہمیشہ مے کو افکار سے نجات کا ذریعہ سمجھا۔ اور اگر اس دار الجزا میں بھی میری قسمت میں افکار سے رہائی ناممکن ہے تو مجھے اس مے "اندوہ ربا" کے دو جرعے پینے سے گریز نہیں"

کراماً کاتبین اس جرأت رندانہ پر متحیر اپنی جگہ رہ گئے

ندائے غیبی: "ہمیں تیری صاف گوئی بہت پسند آئی، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ بقیہ الزامات سے بری الذمہ ہو گیا۔ لیکن اتنی رعایت تیری منظور ہے کہ تو خود بتا کہ تو نے کون کون سے گناہ کئے ہیں"

غالب: کریا وائے پردہ پوش عاصیاں! مجھ ذرہ بے مقدار کی کیا مجال حکم عدولی کا خیال تک دل میں لاؤں، لیکن اس یقین کے ساتھ کہ تری رحمت تیرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور میں اسی رحمت کے دامن پناہ میں بکر بارگاہ اقدس میں بصد التجا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ"

(یہ بیباک طرز جواب سنکر کراماً کاتبین کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ سر سے پیر تک کانپنے لگے کچھ سایوں میں بھی ہلکی جنبش پیدا ہو گئی۔ لیکن ملاء اعلیٰ کی اس خنک روشنی میں تبدیلی نہیں ہوئی)

ندائے غیبی: "اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمھیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے جنھیں تم بیان نہیں کرنا چاہتے، اس لئے اپنے گناہوں کی پاداش کے لئے تیار ہو جاؤ"

غالب یہ سنکر سن سے ہو گئے ساری طاقت غائب ہو گئی۔ لیکن اس نے جرأت کرکے پھر رحمت تمام کو اپیل کی:

"یا ارحم الراحمین - تیرا فرمانا برحق - اس ذرۂ بے مقدار کو تاب چون و چرا کہاں - اگر بارگاہ جلالت سے میرے حق

میں فیصلہ ہوا ہے تو مجھے جائے گفتگو کجا، لیکن (ذرا زور سے)

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(کراماً کاتبین تو یہ بے ادبی دیکھ کر سبوحٌ قدوسٌ ربنا ورب الملائکۃ والروح پڑھتے ہوئے خوف کے مارے سجدے میں گر پڑے۔ سایوں میں بھی یہاں سے وہاں تک ایک لرزش پیدا ہو گئی۔ کچھ نگاہیں غالب کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ کچھ نظریں عرش کی طرف تھیں کہ کب اس گستاخ خاکی پر صاعقہ گرتی ہے لیکن نور پرسکون میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد پھر آواز آئی)

"غالب خاکی نژاد ہر چند تیری گستاخیاں ناقابل عفو ہیں اور ان کا تقاضا یہ ہے کہ تجھے چشم زدن میں تیرے کیفر کردار کو پہونچا دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو لیکن ہماری بارگاہ میں تیری ادائے ترکانہ پسند آگئی ہے اسلئے تو اب تک یہاں نظر آرہا ہے۔ بجز یاوہ گوئی کے تو نے اپنے گناہوں سے بریت کے سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کراماً کاتبین کی مرتبۂ فرد جرم بالکل صحیح و درست ہے"

(غالب بھرسٹ پٹائے کچھ دیر سوچتے رہے۔ آخر اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے کے لئے طیار ہو گئے)

غالب : "یا عافی العافین! مشت خاک غالب کی جرأت کہاں کہ احکام خداوندی کے خلاف کچھ کر سکے لیکن اتنا ضرور عرض کرنے کی رخصت چاہتا ہے کہ اس عدالت ربانی اور سلاطین ارض کی عدالت میں فرق ہونا چاہئے"

ندائے غیبی: "کیا مطلب ہے تیرا"

غالب : (گڑگڑا کر) "ایک طرفہ کارروائی پر اجرائے ڈگری کا حکم اس بارگاہ قدس کے شایان شان نہیں ہے"

ندائے غیبی: "تیری اس گفتگو کا ماحصل کیا ہے"

غالب : "اے بے آسراؤں کو پناہ دینے والے۔ خاکم بدہن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

(کراماً کاتبین یہ سنتے ہی غصہ سے لال ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب غالب پر ٹوٹ پڑیں گے لیکن عدالت کا رعب و داب انھیں روکے ہوئے ہے)

غیبی ندا: "غالب تری جرأت و بیباکی کی حد ہو گئی، ہوش میں آ تو کس سے مخاطب ہے"

غالب : (خجالت کے انداز میں) کرم گسترا!

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

غیبی ندا: "گنہگار بندے۔ تیری ادائے شرمساری بھی ہمیں بھا گئی، تیری کوتاہیاں معاف کی گئیں، جا اور ہماری رحمت بے پایاں کے ثمرات سے لطف اندوز ہو۔ میکائیل و عزرائیل اسے رضواں کے سپرد کر دو"

(روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ دو سائے غالب کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں، کہیں کہیں کوئی تارہ جھلملاتا نظر آتا ہے اور تمام سائے اور کراماً کاتبین فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں)

پانچواں سین

جنّت کا دروازہ

(غالب اور رضوانؔ)

منظر ——— ایک بہت بڑا سفید پھاٹک ہے۔ جو نقش و نگار سے بالکل معرا ہے صرف اس کے اوپر جگمگاتے ہوئے تاروں میں دار السلام لکھا ہوا ہے۔ پھاٹک کے قریب ایک نورانی صورت بزرگ تسبیح لئے مصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں ایک جریب زیتونی بائیں طرف رکھی ہوئی ہے۔ یہ بزرگ آنکھیں بند کئے تہلیل و تسبیح میں مصروف ہیں۔ دانے کھٹ کھٹ ہاتھ کی حرکت سے نیچے گر رہے ہیں۔

غالب جن میں سرے سے کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ نہ جھریاں ہیں نہ رعشہ، نہ بدن پر زخم ہیں۔ ایک تنومند اور سُرخ و سپید جوان رعنا کی شکل میں فیقائل و عنکائیل کی معیت میں دروازے کی طرف آ رہے ہیں، دونوں فرشتے مصلے سے ذرا دور رک جاتے ہیں اور السلام علیکم یا رضوان کہکر ان پاسبانِ در کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

غالبؔ نے رضوان کا نام سنکر ذرا تنقیدی نگاہ سے انھیں سر سے پیر تک دیکھا اور زیر لب مسکرائے)

رضوان نے آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور پر رعب آواز میں "وعلیکم السلام یا اخی" کہہ کر جواب دیا اور کنکھیوں سے غالبؔ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: یہ ناوقت کیسے آنا ہوا؟ یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟

عنکائیل: "یہ غالبؔ ہیں"

رضوان: "غالبؔ کون؟"

اس سے پہلے کہ فرشتے کچھ جواب دیں غالبؔ نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے نہایت منہ سکھا کر کہا:-

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

رضوان نے شعر سُن کر تیکھے چتونوں سے غالبؔ کو دیکھا۔ لیکن ہاتھ کے اشارے سے پھر فرشتوں سے پوچھا کہ کون ہیں

فیقائل: "یہ دہلی کے مشہور و مستند شاعر ریختہ و فارسی مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ہیں۔ آج ہی دار العمل سے دار الجزا میں آئے ہیں۔ اور ابھی ابھی انھیں بارگاہِ الٰہی سے آمرزش کا پروانہ عنایت ہوا ہے اور بحکم رب العالمین ہم انھیں آپ کے سپرد کرنے آئے ہیں"

رضوان: (اُچھل کر) کون! اسد اللہ خاں غالبؔ! میرزا نوشہ! منکرِ جنّت! اور اس کی آمرزش... جنّت کا پروانہ

عرش کی طرف سر اُٹھا کر خداوندا! تیرے اسرار سے ہم سب ناواقف ہیں۔ پھر دھیمے پڑ کر اور غالب کی طرف مڑتے ہوئے "مگر تم کو یہ طاقِ نسیاں کا گلدستہ کیسے یاد آیا؟"

غالب: "تیوریاں بدل کر کیا مطلب"

رضوان: "کیا تم نے دنیا میں یہ شعر نہیں کہا تھا:۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

غالب: یاد کس مسخرے کو آئی اور طلب کس منھ سے کرتا۔ میرا مقولہ تو یہ ہے کہ:

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

رضوان: "تو پھر ارادہ کیا ہے"

غالب: "خوب، یہ آپ کا تجاہل عارفانہ ہے، آپ کے پاس بھیجا کس لئے گیا ہوں کہ آپ مجھے جنّت کی سیر کرائیں"

رضوان: "مگر تم تو دنیا میں جنّت کو دوزخ میں جھونک دینے پر آمادہ تھے"

غالب: "ہائے ہائے جو رونا مجھے دُنیا میں تھا وہی یہاں بھی ہے۔ واہ ری قسمت!

رضوان: (پیچ و تاب کھا کر) اس جملہ کے کیا معنی؟

غالب: "جب تک دنیا میں رہا اس غم میں خونِ جگر کھایا کیا کہ مرا کلام نہ لوگوں کی سمجھ میں آیا اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس خیال سے کچھ کچھ تسلی ہو جایا کرتی تھی۔ کہ خیر یہاں نہ سہی عالم ارواح میں قدسیوں سے داد کلام پاؤں گا مگر دیکھتا ہوں تو یہاں بھی ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا مضمون نظر آتا ہے"

رضوان: (اس جواب سے کچھ جزبز ہوئے اور زرا رک کے بولے) "خیر تمھیں جنّت میں تو لئے چلتا ہوں مگر جس فکر میں آپ جا رہے ہیں وہ کہیں نام کو بھی نہیں ملے گی۔ اس سے خاطر رکھئے"

غالب: "آپ کی یہ چیستانی تقریر تو میری سمجھ میں آئی نہیں، اس معمہ کو آپ ہی حل فرمائیں"

رضوان: (بھنا کر) یہ شعر تمھارا نہیں ہے؟

غالب: "کون شعر؟"

رضوان: یہی کہ:۔ وہ چیز جسکے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

غالب: "جی شعر تو میرا ہے۔ لیکن میں نے آپ سے بادۂ گلفام کی درخواست کی ہوتی تب آپ کہتے۔ اس قبل از مرگ واویلا کے کیا معنی؟

رضوان: (لاجواب ہو کر) اچھا خیر چلو۔ مگر ٹھہرو ایک بات کا وعدہ کرو کہ سیر باغ کے بعد کوئی آئیں بائیں شائیں رائے نہیں دو گے"

غالب : "آپ کو یہ شبہ کیسے پیدا ہوا"

رضوان : "بات یہ ہے کہ تمھارے اس شعر سے مترشح ہوتا ہے :

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ　　　خلد بھی باغ ہے خیر آب وہوا اور سہی

کہ تم اسے بھی ارضی باغوں کا سا سمجھتے ہو"۔

غالب : "جھلاکر" میں خیر جنت سے درگزرا، آپ تو نکاح کی سی شرطیں قبلوا رہے ہیں (ایک طلائی کارڈ بڑھاتے ہوئے) لیجئے پروانۂ جنت - میں ان پابندیوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے سے درگزرا۔ یہ کہکر چلنے کیلئے مڑتے ہیں

رضوان : ٹھہرو ٹھہرو۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم ذرا آدمی مخدوش ہو اس لئے مجھے اتنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنا پڑیں ورنہ میں تو بلا ایک لفظ کہے لوگوں کو جنت میں داخل کر دیا کرتا ہوں۔ میرا بس چلتا تو میں تم کو ہرگز بہشت کے اندر قدم نہ رکھنے دیتا۔ مگر حکم حاکم مرگ مفاجات اور حکم بھی رب العالمین کا! سرتابی کی مجال نہیں۔ اچھا چلو"۔　(غالب اور رضوان ساتھ ساتھ دروازے میں داخل ہوتے ہیں)

غالب نے محاکمانہ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا شروع کیا اور رضوان کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتے رہے، بشرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت زیادہ پسند نہیں آئی ٹہلتے ٹہلتے دور پر تیز و تند شعلے اُٹھتے نظر آئے۔

غالب : "یہ تیز روشنی کیسی ہے ؟"

رضوان : "نار دوزخ کا التہاب ہے"

غالب بغیر سوچے سمجھے عرش کی طرف سر اُٹھاکر بار الٰہ تو اپنے کرم بے پایاں اور رحمت لامتناہی کے صدقے مجھ گنہگار کو وہ کچھ عطا کیا جس کا میں کسی طرح اہل نہ تھا۔ ایک آخری آرزو میری اور پوری ہو جائے!"

غیبی ندا : "اب کیا چاہتا ہے"

غالب : کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لوں یارب　　　سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیبی ندا : نادان - تیری جو بات ہے نرالی ہے - تیری یہ آرزو پوری ہونے سے کیوں رہ جائے۔ جا اور اپنی احمقانہ خواہش کا تماشا دیکھ!

(دوزخ کے شعلے آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں پہلے تو غالب نہایت ذوق و شوق سے ان کے رقص و تموج کا تماشا دیکھتے رہے۔ شعلے قریب تر ہوتے گئے۔ اب غالب تپش اور التہاب سے پریشان ہونے لگے، شعلے اور قریب آئے غالب حدت سے گھبراکر سجدے میں گر پڑے اور گڑگڑاکر چیخنے لگے :- "بار الٰہ - بس بس میں ان شعلوں سے کھیلنے کی تاب نہیں۔ میں اپنی احمقانہ خواہش سے بھر پایا۔ جان آفرینا! مجھے اس عطیے سے معاف رکھ۔ گرمی سے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ شعلے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں ....

سراج احمد علوی - ایم - اے

تیسری لڑائی کے بادل

تیسری لڑائی کا خیال آتے ہی سب کے منھ سے نکل جاتا ہے کہ اب دُنیا میں تیسری لڑائی کیوں؟ ابھی ابھی تو دُنیا نے آگ اور انگاروں کی برکھا سے چھٹکارا پایا ہے اور پھر اس لڑائی کی آگ میں گر جانے سے جن کے بدن جُھلسے ہیں اُن پر ابھی نئی کھال آتی جا رہی ہے۔ بڑی بڑی طاقتیں کل ہی تو کندھا ملا کر دشمن سے لڑ رہی تھیں اب کس طرح سمجھ میں آئے گا کہ پھر سے لڑائی کے کالے کالے بادل دور منڈلاتے دکھائی پڑنے لگے ہیں، ابھی تو دشمن کی تکا بوٹی کر کے اپنا اپنا حصّہ بانٹ لینے کا کام ہی ختم ہوا ہے۔ اب لڑائی کیوں؟ پھر یہ بھی ہے کہ جون ۴۵ء کی فریسکو کانفرنس کو ابھی زیادہ دن نہیں بیتے، جہاں چھوٹی بڑی جگی قوموں کے چارٹر میں سب نے مل کر ملی جلی قوموں کی ایک سبھا یو۔این۔او۔ کی بنیاد ڈالی تھی اور ڈنکے کی چوٹ دُنیا میں اعلان کیا تھا کہ یو۔این۔او کا کام دُنیا کو ہمیشہ کے لئے لڑائی سے بچانا ہوگا۔ یو۔این۔او کے بننے کے بعد تو دنیا کو بے فکری ہونے لگی اور بھروسہ ہونے لگا کہ اب دُنیا میں آگ اور انگاروں کی برکھا نہ ہوگی۔ لوگوں کے دلوں کا ڈر مٹے گا، دُنیا میں سُکھ اور شانتی کا بول بالا ہوگا۔ ایک طرف ہتھیاروں پر کنٹرول ہوگا تو دوسری طرف آگ اور بارود سے کھیلنے والوں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ ہتھیاروں اور تباہی پھیلانے والے جنگی سامان پر پابندی لگ جائے گی۔ یو۔این۔او۔ اب کسی قوم کے ادھیکاروں کا خون نہ ہونے دے گی۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد دُنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے دماغ آج کی دُنیا میں جو معاملے ہو رہے ہیں، اُن پر سوچتے ہیں اور جو یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا کا گولا کتنی تیز چال سے اپنی کیلی پر گھومتا ہے اور اس گولے پر بسنے والے کس کس طرح گھوم سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی آنکھیں دُنیا کے گولے کے ساتھ ساتھ گھومتی ہیں اور جو کچھ آجکل دُنیا میں ہو رہا ہے اُس سے یہ اپنی آنکھیں بند کرنا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ آج دُنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں جو کھینچا تانی ہو رہی ہے اور جو قلعے بندیاں اور مورچا بندیاں آج ہو رہی ہیں اور جس طرح آج یہ طاقتیں اپنی اپنی دیواریں مضبوط کر رہی ہیں اور نئے روپ نئے بھیس بدل کر دُنیا کے سامنے آ رہی ہیں اُس سے یہی جان پڑتا ہے کہ دُنیا کو پھر ایک تیسری لڑائی میں جھونک دیا جائے گا۔ تیسری لڑائی ہو گی چاہے دیر بھلے ہی لگے۔ اس کے کئی کارن ہیں، پہلا تو یہی ہے کہ جس سمے ہٹلر کی توپیں دور یورپ میں گرج رہی تھیں اور بڑی بڑی طاقتیں یالٹا میں ایک کانفرنس میں اکٹھا تھیں اور جن سب نے ملکر دشمن کو ہرایا

اور لڑائی جیتی، آج اُن کے من صاف نہیں ہیں اور لڑائی ختم ہوتے ہی ہر ایک اپنی اپنی گھاتیں مضبوط کرنے کی طرف زیادہ جُٹا ہوا ہے۔ یو۔ این۔ او کے لوگوں ہی میں خود اختلاف یا مت بعید ہے اور اگر کھُلم کھُلا کم ہے تو اندر اندر۔ یہ فرق اور دلوں کا میل بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس فرق کا بڑھنا اور قایم رہنا لڑائی کے آنے کی ایک نشانی ہے۔ دوسرے دنیا میں آج ایک طرف تو سامراجی یا شہنشاہی نظام (ویوستھا) ہے اور دوسری طرف سامراجی اور شہنشاہی نظام کو جڑ سے کھود کر پھینک دینے والی سامیہ وادی ویوستھا ہے۔ لڑائی کے ختم ہوتے ہی بڑی طاقتوں کی آپس کی کانفرنسیں ابھی تک چالو ہی ہیں لیکن کانفرنسوں میں کرسی کے آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو شبہ کی نظروں ہی دیکھتا ہے۔ ایک کو دوسرے کی سچائی پر بھروسا نہیں ہے۔ یہ فرق اور سندیہہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بڑی طاقتیں لڑائی کے بعد دُنیا کی مالک بن بیٹھنے کے دھندلے خیالوں اور سُنہرے سپنوں میں مگن ہو رہی ہیں۔ بڑی طاقتیں چاہتی ہیں کہ اپنے ہر طرح کے بل پر اُن کے پاس والی چھوٹی یا کمزور قومیں اُن کی مٹھی میں ہوں اور اس طرح ناکہ بندی کے لئے دوسرے مقصد حاصل ہوں پچھمی یورپ اور بیچ پورب کے دیشوں میں انگلینڈ اسی چال بازی پر تُلا ہوا ہے۔ روس بلقان، بیچ یورپ، بیچ پورب اور روم ساگر پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ امریکہ پونجی کے نشے میں مست ہو کر اپنے سمندروں سے ہزاروں میل دور ایشیا میں پہونچکر چین اور شانت ساگر پر قلعے بندوں کی بنیادیں ڈال ہی چکا ہے۔ آج بیچ پورب کے دیش اور روم ساگر دنیا کے بڑے خطرے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ انگلینڈ، امریکہ کے ڈالروں کے بل پر بیچ پورب اور روم ساگر کے دیشوں میں جو آج مضبوطی کر رہا ہے اور یہ کوشش ہو رہی ہے کہ روس کو یہاں سے ہٹایا جائے تو روس اس طرح یہاں سے اپنی آنکھیں کیوں ہٹائے گا جب کہ روس کے اگلے جیون کا سہارا یہی دیش ہو سکتے ہیں۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں یہی مقابلہ ہو رہا ہے پچھلے دنوں پوٹسڈم سمجھوتے میں یہ بات طے کی گئی ہے کہ جرمنی کی فوجی طاقت کو بالکل ختم کیا جائے اور جرمنی کو چار ٹکڑوں میں بانٹ کر حکومت کی جائے لیکن جیسے ہی جرمنی سے فیسزم اور نازی ازم بالکل مٹ جائیں تو جرمنی میں جمہوری یا لوک تنتر وادی حکومت بنائی جائے۔ اب جرمنی کا جو حصہ روس کے بھاگ میں آیا ہے وہاں کی حکومت میں تو جرمنی لوگوں کو حصہ دیا جا رہا ہے پر برطانیہ اور امریکہ کے بانٹے میں جو حصے آئے ہیں وہاں دوسرا حال ہے۔ وہاں اپنے اپنے مالی فائدے کا سب سے بڑا خیال ہے۔ لوگوں کو اس بات سے روکا جا رہا ہے کہ کہیں اُن حصوں میں روسی کمیونزم نہ پھیل جائے۔ بڑی طاقتیں اپنے بیری جرمنی کو اتنا کچل دینا چاہتی ہیں کہ جرمنی اگر بالکل مٹ نہ سکے تو اتنا کمزور ہو جائے کہ کوئی کھٹکا نہ رہے اور وہاں کی قیمتی پیداوار اور کھانوں کی دولت پر قبضہ جا رہا ہے۔ فرانس کی نیت جرمنی کے اوپچاؤ علاقوں کے کوئلے اور لوہے پر چھی ہوئی ہے اور سب یہی چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے حصوں میں جرمن لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا جائے لیکن دبی ہوئی چنگاری بھی کبھی کبھی جوالا کا روپ لے لیتی ہے، جرمن قوم سدا کے لئے مٹ نہیں سکتی۔ جرمنی ہی لڑائی کا کارن ہوگا۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہمیشہ لڑائی کا سبب رہی ہیں۔ پولینڈ، زیکوسلوویکیا، یوگوسلوویا، بلگیریا،

رومانیا، البانیا اور گریس کو ایک دوسرے کے خلاف سامراجی طاقت اندر اندر بھڑکا رہی ہے اور ان ریاستوں کا آپس کا بیر انھیں اپنی مدد کے لئے بڑی بڑی طاقتوں کے پیروں پر گرا رہا ہے۔ شاہنشاہیت اور روسی کمیونزم کا آمنے سامنے نہیں تو اندر اندر بھرپور مقابلہ ہو رہا ہے۔ امریکہ اور انگلینڈ کو دھڑکا ہے کہ کہیں روسی کمیونزم دنیا میں نہ پھیل جائے اور امریکہ اور انگلینڈ کے روس سے ور ودکا یہی کارن ہے۔ روسی کمیونزم کے خلاف انگلینڈ بیچ یورپ کے دیشوں کی پوری مدد کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ روسی کمیونزم کے خلاف اگر وقت آئے تو اپنے دشمن جرمنی سے بھی کام لے۔ اس جگہ ہمیں انگلینڈ کے کچھ نیتاؤں کی وہ باتیں یاد آتی ہیں جو انھوں نے اسوقت کہی تھیں جب کمیونزم کے خلاف ہٹلر زور دکھا رہا تھا۔ ہندوستان کے پہلے کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ایمری نے کہا تھا کہ "ہم کسی ایسی پالیسی پر چلنے کی ہمت نہیں کر سکتے جو ہمیں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف بھڑا دے"، پھر پارلیامنٹ کے ایک ٹوری ممبر مسٹر بیورلی باکسٹر نے کہا تھا کہ "کبھی کبھی ہم اس پارلیامنٹ کے وہ لوگ بڑی بے وقوفی کرتے ہیں جو اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ نیشنل سوشلزم میں کوئی اچھائی نہیں ہے یا ہٹلر اور گوئرنگ جیسے انسانوں کی سچائی اور صاف دلی سے انکار کرتے ہیں" پارلیامنٹ کے ایک دوسرے ٹوری ممبر سر تھامس مور نے تو سب سے بڑھ چڑھ کر ہٹلر کی تعریف کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "امن اور انصاف تو ہٹلر کی پالیسی کا اصل مقصد ہے۔ ہٹلر کو موقع دیجئے، مجھے اطمینان ہے ہٹلر پوری طرح ایماندار اور سچے ہیں"۔

اب یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انگلینڈ روس کے خلاف ہر طاقت کی مدد کو طیار ہے۔ اگر ہو سکے تو ہارے ہوئے جرمنی کی بھی مدد کرے گا۔ گریس، ٹرکی اور سعودی عرب ملکوں کو امریکہ نے ابھی قرضہ دیا ہے، انھیں دیشوں میں انگلینڈ اپنا اثر جماتا رہا ہے اور اگر امریکہ ان دیشوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے تو روس کب چپکا بیٹھے گا اسلئے کہ اگر روس ایسا نہیں کرتا تو وہ آج دنیا میں چاروں طرف سے گھرا ہوا ملک رہ جاتا ہے اور ساری دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ پوربی روم ساگر، بیچ پورب اور دور پورب کے دیشوں میں تیل کے چشمے ابلتے ہیں اور انھیں دیشوں سے جس طرح بن پڑے انگلینڈ اپنا ناتا اور بھی مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ یہ کسی بل پر ہو یا لالچ دیکر، جیسے وہاں کی چھوٹی سی ریاست ٹرانس جارڈن کو آزادی دے کر انگلینڈ نے اس سے اپنا ناتا اور بھی مضبوط کر لیا ہے۔ یہ سب ہوتے پر بھی گریس، رومانیا، بلگیریا، البانیا میں ایک طرف سامراجی اور دوسری طرف روسی پارٹیوں میں مقابلہ ہے۔ جرمنی اور گریس میں انگریزی فوجیں پڑی ہیں تو روس بھی قریب ہے۔ مصر سے انگریز ہٹے نہیں ہیں اور نہ ہٹنے کی پوری امید ہے، انگلینڈ امریکہ کے ڈالروں کے بل پر اپنی فوجی طاقت بڑھا ہی رہا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں انگلینڈ کے پاس اس کی فوج ۵ لاکھ تھی، پر ۱۹۴۶ء میں (دوسری لڑائی کے بعد) انگلینڈ کے پاس ۲۰ لاکھ فوج تھی ۱۹۳۹،۴۰ء میں انگلینڈ اپنی فوجوں پر ۳۵ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ خرچ کرتا تھا اور آج کل وہ ایک ارب ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ اپنی فوجوں پر خرچ کر رہا ہے۔ اسی بارے میں ابھی حال میں پارلیامنٹ کی مزدور پارٹی کے ایک ممبر مسٹر ڈرائیکس نے انگلینڈ کے بڑے وزیر مسٹر ایٹلی سے

پارلیامنٹ میں پوچھا تھا کہ "اگر ہم امریکہ یا روس سے لڑائی ہونے کا خیال نہیں کرتے تو کیوں اپنی مالی حیثیت سے باہر پہلے سے تین گنی فوج رکھ رہے ہیں؟" مسٹر اٹیلی نے گول مول شبدوں میں جواب دیا۔ "یہ سوال ہر اُس ملک سے پوچھا جا سکتا ہے جس کے پاس ہتھیار بند فوجیں رہتی ہیں۔"

یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، تعجب کی بات نہیں ہے یہی لڑائی کی طیاری کے منصوبے ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ روس کے چاروں طرف گھیر اڈالنے کی دیواریں اُٹھا رہے ہیں اور روم ساگر اور دوسرے سمندروں اور دیشوں میں عمل دخل رکھنے کی آج ضرورت ہے۔ امریکہ نے چین میں اڈا بنا لیا ہے اُسنے آٹھ لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی مدد دی ہے اور دوسرا جنگی سامان بھی دیا ہے۔ امریکی فوجیں چین میں رکھنے کے علاوہ ہوائی اور سمندری سمجھوتے بھی ہوئے ہیں۔ امریکہ نے چین کے قرضے ادا کرنے کی مدت دس برس اور بڑھا دی ہے، پر ابھی تک چین میں ایک طرف کیومنٹانگ اور دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی میں جھگڑا چل رہا ہے، چیانگ کائی شیک کو اپنے دیش سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے امریکہ پر بھروسا ہے تو کمیونسٹ پارٹی جانتی ہے کہ چین اور روس زیادہ دور نہیں ہیں۔ دونوں دیش اتنی ہی دور ہیں کہ ایک دیش دوسرے دیش کے لوگوں کی آوازیں سُن سکتا ہے۔ روس اور امریکہ میں جھڑپ ہونے کے ڈھنگ بیچ ایشیائی دیشوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ امریکہ ایران کی کھاڑی پر آنکھیں جما سکتا ہے تو روس، ایران پر چھایا ہوا ہے۔ دور ایشیائی کنارے پر بڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ سمندری دیوار شانت ساگر کے سہارے سہارے بنا رہا ہے اور قلعے بندی ہو رہی ہے۔ منگولیا میں جھگڑے چل رہے ہیں۔ کوریا بھی جھگڑوں میں جُٹا ہوا ہے۔ منچوریا [illegible] میں ایک بھاری جنگی حیثیت رکھتا ہے۔ جاپان میں امریکہ کا جنرل میکارتھر جاپان کی ہر چیز کو مٹا رہا ہے پر یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ جاپان کی ہر چیز کو تو مٹایا جا سکتا ہے پر جاپانی قوم کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون کوئی نہیں بدل سکتا۔ اگست سنہ ۴۵ء میں جاپان کے روپ ہیروشما پر امریکہ نے ایٹم بم گرا کر ۲۵ لاکھ جاپانیوں کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ یہ امریکہ کی امن پسندی کا بڑا ثبوت ہے۔ اس سال جولائی میں امریکہ کی آزادی کے دن تقریر کرتے ہوئے ٹرومین نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ امن پسندی اور دُنیا کی سلامتی کی ٹھیکیداری کا پھر راگ الاپا ہے۔ ٹرومین نے بھاشن میں زور دے کر کہا۔ "دُنیا میں امن چین بڑی حد تک اس بات پر قایم رہے گا کہ قوموں میں کتنی ترقی ہوتی ہے، اور یو۔ این۔ او کے انسانی حقوق کی حفاظت پر بھی شانتی کا دارومدار ہوگا۔"

اسی طرح ہٹلر سنہ ۳۷ء سے سنہ ۳۹ء تک دُنیا کی صلح اور شانتی کا خوب خوب دعویٰ کرتا رہا تھا اور دُنیا کے امن کی طرف داری کا کھلا ہوا ڈھونگ رچاتا رہا تھا۔ امریکہ نے ہیروشما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر دُنیا میں جو ڈھنڈھورا پیٹا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے ہے کہ امریکہ دُنیا میں اب سب کی جانیں لے سکتا ہے۔ پر یہ بات تو کھلی ہوئی ہے کہ ایٹم بم ابھی تک صرف ایک منووگیانک یا نفسیاتی ہتھیار ہے اور اسے استعمال کرنے کا فوجی طریقہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ گہرائی

سے دیکھنے سے یہ سچی اور ٹھوس بات سامنے آجاتی ہے کہ آج کل کے سائنس کی اُنتی اور نت نئی ایجادوں کے زمانے میں ایٹم بم یا کاسمک ریز پر ہی آکر سائنس کی ترقی اور ایجادیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ سائنس تو بڑی تیزی سے ترقی کرتی جارہی ہے اور نہ معلوم کون کون نت نئی ایجادیں اور سائنس کے چمتکار دُنیا کے سامنے آتے رہیں گے۔ ایٹم بم لڑائی اور امن کا فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ مسٹر اسٹالن بھی یہی کہتے ہیں۔ پچھلے سال ایک مشہور اخباری نمائندے نے دوسرے سوالوں کے علاوہ یہ بھی سوال کیا کہ "کیا آپ کو یقین ہے کہ ایٹم بم پر امریکہ کی ٹھیکیداری امن کے لئے بڑا خطرہ ہو سکتی ہے؟" مسٹر اسٹالن نے کہا:۔ "میں ایٹم بم کو اتنی اہم چیز نہیں سمجھتا جتنا کہ دوسری راج نیتی جاننے والے خیال کرتے ہیں۔ وہ لڑائی کا فیصلہ ایٹم بم سے نہیں کر سکتے اس لئے کہ ایٹم بم اس کام کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہے۔"

پچھلے برس جب بکنی میں تجربے ہو رہے تھے تو ہمارے دیش کے ایک بڑے نیتا نے کہا تھا۔ "یہ کمزور قوموں کو ڈرانے کے لئے ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔" اگر ہم دُنیا کی تاریخ دیکھیں تو کئی جگہ ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ کبھی کبھی ہتھیار اور طاقت استعمال کرنے کے بجائے صرف دھمکانے اور ڈرانے ہی سے کام نکل جاتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو، یہ کہنا پڑے گا کہ امریکہ اور انگلینڈ جو ساری دُنیا کو دو حصوں میں بانٹ لینے کی فکر میں ہیں وہ ایک سپنا ہی رہے گا۔ ایشیائی دیشوں میں اب آزادی کی ہلچل بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ برسوں سے جن ایشیائی دیشوں کو غیر قوموں نے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا ہے وہ سارے ایشیائی دیش آج ایکتا کی لڑی میں بندھنے کے لئے قدم بڑھا رہے ہیں۔ انگلینڈ کی برٹش شاہی اب تلواروں کے بل پر قایم نہیں رہ سکتی۔ دُنیا اب امن چاہتی ہے اور دُنیا میں امن سُکھ اور شانتی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب بڑی بڑی طاقتیں دوسروں کو اپنے پیروں تلے کچلنے کا کام بند کر دیں۔ قوموں کے حقوں کی اُچت رکشا ہو۔ دور دیشوں اور دُنیا کے سارے سمندروں پر قبضہ جمانے کی جگہ بڑی طاقتوں کو ہر ایک کی چیز جھپٹ لینے اور دبا لینے کا خیال چھوڑنا ہوگا۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ایک لڑی میں باندھا جائے۔

آج انڈونیشیا کی آزادی کے اندولن کو ہر طرح کُچلا جا رہا ہے۔ مُٹھی بھر ڈچوں کی پیٹھ پر بڑی طاقتوں کی بھاری مدد ہے۔ امریکہ اور انگلینڈ، انڈونیشیا جیسے ملک کی جنگی پوزیشن خوب سمجھتے ہیں۔ آج ڈچ انڈونیشیا میں اپنے بل پر نہیں کود رہا ہے، اُس کی پیٹھ پر دوسروں کا ہاتھ ہے جو اپنے مطلب کے لئے انڈونیشیا کو اپنی مُٹھی میں جکڑ رکھنا چاہتے ہیں۔ ملایا میں انگریزی فوجیں اپنی سنگینیں جنتا کے سینے پر جمانے کو تُلی ہوئی ہیں۔ برما کی آزادی ایک دھوکا ہے۔ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے ہندوستان کی ہزاروں برس کی ایکتا کو کچل دیا گیا ہے۔

امریکہ اور انگلینڈ کو آج روس کا بڑا دھڑکا ہے۔ ۱۸۰۱ء میں جب انگلستان اور فرانس میں لڑائی ہوئی تو انگریزوں کو روس اور نپولین بوناپارٹ کے بھوت نے ستانا شروع کیا۔ انگریزوں نے اپنی ساری طاقت سرحدی علاقوں میں بھری۔ اپنی ہندوستان کی نئی حکومت کی حفاظت کے منصوبے باندھے۔ افغانستان اور ایران کے بادشاہوں سے

میں ملاپ کر کے اپنی مضبوطی کرلی۔ ۱۸۶۹ء میں جب روس بیچ ایشیا کے دیشوں میں بڑھ رہا تھا تو افغانستان کے امیر شیر علی کو روس کے خلاف بھڑکا کر اپنی دوستی کرلی تھی اور آج ایسا ہی لالچ بڑھایا جا رہا ہے۔ دُنیا میں امن چاہئے تو لالچ بند کرنا ہوگا۔ امریکہ اور انگلینڈ کو ایشیا کے دیشوں سے بوریا بستر باندھنا ہوگا۔ ایشیائی کانفرنس کے موقع پر دلّی میں ہمارے دیش کے بڑے نیتا پنڈت نہرو نے دُنیا سے امن اور شانتی کے لئے وینڈل ولکی کی "ایک دُنیا" پر زور دیا تھا اور آج دُنیا میں امن کی گارنٹی تبھی ہوگی جب کہ دُنیا ایک ہو جائے۔ ایشیا کے دیشوں میں ملاپ اور ایکتا کے لئے آج تڑپ پیدا ہو رہی ہے اور ایشیائی قومیں جس طرح اپنی باتوں سے آپس کے میل اور ایکتا کا پرچار ایشیائی کانفرنس میں کر چکی ہیں اُنھیں اب اپنے عمل سے اُسے ثابت بھی کرنا ہے۔

(نیا ہند) بھائی این - اے - جناح

(نگار) یہ مضمون بھائی این - اے جناح کا ہے اور زبان کے معاملہ میں بہت روادار جماعت کے نقطۂ نظر سے صحیح ہندوستانی کا نمونہ ہے:

قابل مضمون نگار نے یہ مقالہ اپنے خیال سے بہت آسان ہندوستانی زبان میں لکھا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ مضمون کو انھوں نے اس کوشش میں اور زیادہ مشکل کر دیا ہے۔

عربی و فارسی الفاظ سے احتراز یقیناً مناسب ہے، اگر ہم ان کے ترک سے مضمون کو زیادہ آسان اور قریب الفہم بنا سکیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر عام افادہ و استفادہ کا مقصود اس سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

آپ دیکھیں گے کہ مضمون کی عبارت کچھ اُلجھی ہوئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ ہندوستانی رنگ دینے کے سلسلہ میں بعض مشہور ناموں کا بھی ہندی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور کہیں کہیں ایسے غیر مانوس ہندی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جو عربی فارسی کے مانوس الفاظ کے مقابلہ میں بہت ثقیل ہیں۔

ہم اس مقالہ کو نہ صرف اس لئے شایع کرتے ہیں کہ وہ معلومات کے لحاظ سے کام کی چیز ہے بلکہ اس لئے بھی کہ جس چیز کو ہندوستانی کہا جاتا ہے وہ بھی "بچۂ شتر" سے کم نہیں۔

مالہ وما علیہ

حضرت نیازؔ کے ان تمام مقالات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے اکابر شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں جگرؔ مرادآبادی جوشؔ ملیح آبادی، ماہر القادری، اثرؔ لکھنوی، وحشتؔ کلکتوی، دلؔ شاہجہاں پوری، سیمابؔ اکبر آبادی اور دیگر اکابر شعراء کے کلام پر تبصرہ کر کے اسکے محاسن و معائب کو پیش کیا گیا ہو۔ فن شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے مثل چیز ہے۔ زیر طبع ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

میرزا جانجاناں مظہر

مارچ ۱۹۴۸ء کے نگار میں جناب محمد عظیم صاحب کا ایک مضمون مظہر جانجاناں پر شایع ہوا ہے۔ مظہر سے متعلق بہترین اور مفصل ترین تذکرہ حکیم سید عبدالحئی مرحوم کے گلِ رعنا میں ملتا ہے۔ محمد عظیم صاحب نے اس میں بعض مفید اضافے کئے ہیں۔ میں بھی اس موضوع پر دو ایک باتیں لکھنا چاہتا ہوں۔

اگرچہ بیشتر تذکرہ نگاروں نے مظہر کی جائے پیدائش اکبر آباد لکھی ہے اور اس بارے میں گویا سب متفق ہیں لیکن سن ولادت میں سخت اختلاف ہے۔

بیل اور گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق وہ ۱۱۱۰ھ میں آگرے میں پیدا ہوئے۔

میر "نکات الشعرا" میں فرماتے ہیں: "اصلش از اکبر آباد است"۔

فتح علی گردیزی "تذکرۂ ریختہ گویاں" میں "مولدش و منشائش اکبر آباد" لکھتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں جائے ولادت کالا باغ (صوبہ مالوہ) اور تاریخ پیدائش ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ قرار دیتے ہیں۔ صاحبِ "گلِ رعنا" نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں تذکرۂ "شمعِ انجمن" میں صرف اتنا لکھتے ہیں: "نشو و نمائے ظاہری در آگرہ یافت" جو خود مظہر کے الفاظ ہیں۔۔۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے سید نور الحسن خاں اپنے تذکرہ "طورِ کلیم" میں سن ولادت ۱۱۱۳ھ لکھتے ہیں۔۔۔ سید عبدالوہاب افتخار "تذکرہ بے نظیر" میں لکھتے ہیں:

"تولد او آخر شب جمعہ یازدہم رمضان المبارک سنہ یک ہزار و یکصد و سیزدہ در بعضے سرزمین مالوہ وقتِ مراجعت پدر او میرزا جان از ملک دکن بہ اکبر آباد اتفاق افتاد"

ان سب میں سے قابلِ یقین بیان سید عبدالوہاب کا ہے جس کے مطابق پیدائش ۱۱ رمضان ۱۱۱۳ھ کو ہوئی۔ اگرچہ انھوں نے مقامِ پیدائش "بعضے سرزمین مالوہ" لکھا ہے لیکن بعید نہیں اگر آزاد کے بیان کے مطابق یہ جگہ کالا باغ ہی ہو۔ آزاد نے یہ روایت یقیناً اپنے وقت کے بڑے بوڑھوں سے سنی ہوگی۔ چونکہ ولادت حالتِ سفر میں ہوئی اور اس کے بعد جلد ہی یہ خاندان اکبر آباد پہونچ گیا اور لوگوں کو ان کی پیدائش کی خبر نہیں ہوئی اس لئے قدرتاً انھوں نے خیال کیا کہ وہ اکبر آباد

میں پیدا ہوئے ہیں - بعد کے تذکرہ نویسوں کو بھی اسی سے غلط فہمی ہوئی - لیکن سید عبدالوہاب، میرزا مظہر کا معاصر ہے بعد تالیفِ تذکرہ کے وقت میرزا بقید حیات تھے اس لئے اس کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔

اگر خود میرزا مظہر نے "در عشرۂ اولیٰ مائۃ ثانیہ بعد الف" سالِ ولادت لکھا ہے تو اس سے بھی صرف یہ مراد ہے کہ پیدائش پہلی دہائی کے بعد ہوئی - تعیین سال مقصود نہیں - اسی طرح جب وہ لکھتے ہیں کہ: ——— "نشوو نمائے ظاہری در بلدۂ اکبرآباد یافتہ" تو یہاں مقام ولادت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ زندگی کا ابتدائی زمانہ اکبرآباد میں گزرا جیسے بعد میں فرماتے ہیں کہ تربیت باطنی شاہجہان آباد میں ہوئی۔

پس تاریخ پیدائش آخر شب جمعہ ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۳ھ اور جائے ولادت کالا باغ صوبہ مالوہ درست ہے۔

جناب محمد عظیم صاحب نے ان کے تخلص مظہر سے متعلق مولانا غلام علی آزاد کا بیان بحوالہ "چمنستان شعرا" (شفیق) نقل کیا ہے - لیکن مولوی محمد مظفر حسین صبا نے جو کچھ تذکرہ روز روشن میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود مظہر کو پیش آیا تھا۔

میرزا غلام علی دہلی میں ایک بوڑھے پرانے شاعر تھے - ان کے والد عہدِ عالمگیری میں ایران سے یہاں آئے اور شاہی منصب داروں کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے - میرزا غلام علی فارسی میں شعر کہتے اور مظہر تخلص کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرزا جانجاناں بھی مظہر تخلص کرتے ہیں تو انھوں نے ان سے کہا کہ میاں! میں عمر کی اسّی منزلیں طے کر چکا ہوں اور تم ابھی پچاس سے بھی کم ہو - پس میرا تخلص تم سے متقدم ہے، لہذا تمھیں چاہئے کہ اپنا تخلص بدل ڈالو اور دوسرا رکھ لو - اس پر میرزا جانجاناں نے جواب دیا کہ حضرت آپ کس خیال میں ہیں میں نے تو یہ تخلص مولانا روم قدس سرہ کے اشارہ پر رکھا ہے جو آج سے پانسو برس پہلے فرما گئے ہیں:

جانِ اول مظہرِ درگاہ شد
جانِ جاں خود مظہر اللہ شد

وفات کے افسوسناک واقعے سے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ محرم کے دن تھے - بازار میں سے تعزیے نکل رہے تھے - عزاداروں اور نوحہ خوانوں کا جم غفیر ان کے ساتھ تھا اور تماشائیوں کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی - میرزا مظہر بھی اپنے کمرے پر سے سیر دیکھ رہے تھے ——— ان کے منھ سے نکل گیا کہ بارہ سو برس کے ایک پرانے واقعہ پر آج یہ شور و شغب اور آہ و زاری پھر اس پر کاغذ اور بانس کے بتوں کا یہ ادب و احترام کچھ عقل کی بات نہیں معلوم ہوتی" - ان کی یہ بات عزاداروں میں سے کسی نے سن لی - بس پھر کیا تھا - اگلے دن کہ ساتویں محرم تھی - رات کے وقت دو شخص ان کے مکان پر آئے - دروازے پر دستک دی - میرزا نے خیال کیا کہ کوئی ملاقاتی آئے ہیں - ملازم کبھی رکھا ہی نہیں تھا - خود اُٹھے اور دروازہ کھول دیا - دروازہ کھلتے ہی ان میں سے ایک نے قرابین کا فیر کیا - گولی دل کے قریب لگی تیسرے دن

باغباں رو بمن آور، کہ ثنا خواں توام — چوں صبا، باد فروشِ گل و ریحانِ توام
طرفہ شمعی تو کہ چوں صورتِ فانوسِ خیال — متصل گرد تو می گردم و حیرانِ توام

باز خواہم گلہ از جور تو بنیاد کنم — زیرِ دیوار تو بنشینم و فریاد کنم
گر بسر رشتۂ تقدیر بیابم، مظہر — عوضِ عشق عذابے دگر ایجاد کنم

اے محبت چقدر خانہ بر اندازِ خودی — دل کہ آرام گہت بود خرابش کردی
خدا حافظ ازیں سیلِ رباطِ کہنۂ مظہر — مبادا آستیں از دیدۂ نمناک برداری

مالک رام ام۔اے (اسکندریہ)

(نگار) اس سے قبل محمد عظیم صاحب نے بھی ایک انتخاب روانہ کیا تھا، ملاحظہ ہو:

کفر و دیں امروز مظہر نازہا دارد بمن، — سرو رعنا ساخت عشق میرزا را جا مرا

ندارد کشتن ما صرفہ، رحمے کن بحالِ خود — چراغ خانۂ درد و غم ست اے عشق جانِ ما

دلبراں ہم نالۂ دارند اما نازک ست — بانگ گل ایں نکتہ می گوید بسر گوشی مرا
نیستم نو دولت فقر و فنا مظہر کہ ہست — جز و تن چوں صورت قالی نمد پوشی مرا

جنوں سوئے بیاباں می کشد دیوانۂ ما را، — کہ در کارست جیب پارۂ دامان صحرا را
خداوندا پس از من حال ایں وادی چہ خواہد بود — پس از مجنوں ندید آباد کس اقلیم صحرا را
زعشقِ او بداغے کے تسلی می شوم مظہر — کہ غرق سوختن چوں شعلہ می خواہم سراپا را

بیکسی مشہور کرد آخر بیکتائی مرا — داد تشریف خدائی فیض تنہائی مرا
منکہ مظہر دعوئ تاب و تحمل داشتم — ساخت پیش او خجل ایں ناشکیبائی مرا

در راہ جستجوئے تو تا پا نہادہ ایم — چوں عمر عمر میگذرد در سفر مرا
مظہر مگو کہ پیری و نظارہ بدنما ست — گلگشت لازم ست چو بادِ سحر مرا

بر خاک مات شمع فرستاد و نہ گلے — مردیم و سینہ صاف نشد بدگمانِ ما

میدمی آخر حال باغ اے بے مروت باغباں — رخصتِ روئے چمن دیدن نمیدادے مرا
مطلب او کشتن من نیست ورنہ زیستن — با چنیں تقریب مردن کے روا بودے مرا
آنچہ آوردست بر من دوستی آوردہ ست — کاش با بیگانگی دل آشنا بودے مرا
نامرادی نیست در عالم چو [illegible] کز آشیاں — تا بشاخ گل رسم بگرفت صیادے مرا

تا نفس باقیست چوں نے نالہ سا انیم ما   زندہ تا ہستیم ہچوں شمع گریانیم ما

تا بہ نامحرم نگویم نام جانِ خویش را   مہر خواہم کرد چوں خاتم دہانِ خویش را

قفس دانیم و بس راہ چمن از ما چہ می پرسی   کہ پیش از بال و پر بر داشتند از آشیاں ما را
نفس چوں میکشم از سینہ صد جا بگسلد تارش   چہ زار و ناتواں کرد ست آں موئے میاں ما را
ز تاثیر محبت در دلش کردیم جا مظہر   بجا باشد اگر خوانند یاراں جانجاناں ما را

ہمدم ست بہائے تنہائیست بیتابی مرا   گوئی از بیداریِ بخت ست بیخوابی مرا
چیست آسایش نمیدانم کہ از طفلی چوں دل   در کنار خویش پرورد ست بیتابی مرا

مظہر بجرم نیم نگاہم کہ می کشد   یک بار خود کنید باو روبرو مرا

فشار داد نزاکت زبسکہ رنگ ترا   تن تو ساختہ، گلابی قبائے تنگ ترا

غلام عشقم و لطف و کرم بہائے نیست   کسے کہ بندہ بخواند مرا خدائے نیست
خدا نکردہ بہ برہمن زبت کند فریاد   تو واقفی کہ چہ از نالہ مدعائے نیست
مکن شکایت آں یار تند خو مظہر   ہمیں کہ عاشق و دیوانہ ام خطائے نیست

ضبط اشک و آہ از ما نو گرفتاراں مخواہ   آتش ایں خام سوزاں بے شرار و دود نیست
با جفا و جور با مہر و وفایم نیست کار   ہیچ جز درد و الم از عاشقی مقصود نیست
لذت صد زندگی در نیم کشتن می دہد   تیر مژگان بتاں پیکار زہر آلود نیست

یارب چہ فتاد بلبلاں را   در باغ نشان آشیاں نیست
اے باد صبا ادب ضرورست   ایں مشہد ماست گلستاں نیست
اینست وفا کہ بعد قتلم،   از کوئے تو خونِ من روا نیست،
زنہار شکوہ غرض نیست ایں گماں نبری   کہ عاشقم من و آہ فغاں زبانِ من ست

اڈیٹر نگار کو جو اشعار میرزا مظہر کے یاد ہیں، وہ بھی اسی سلسلہ میں پیش کئے جاتے ہیں:

مظہر زما بُرید و دگر یاد ما نہ کرد   شاید کہ خوشش نبود ز وضعِ کہ خت ما

سر از یں تیغ بُردن آساں نیست   آہ مظہر، خم سلام کسے

محفلے خواہم کہ آنجا وصل جاناں رو دہد   گوشہ ابرو جواب گوشۂ ابرو دہد

در محبت بیشتر جانِ مرا از رشک سوخت   آنکہ بر رویش نظر بسیار نتوانست کرد

بدورِ ما نہ کافرنے مسلماں درد دیں دارد — چراغ کعبہ و بتخانہ بے پروانہ می سوزد

مظہر زجرم نیم نگاہم کہ می کشد — یکبار خود کمند بہ او روبرو مرا

بود محبت ناداں بلا کہ یوسف را — طرب سرائے زلیخا تمام زنداں ست

مگوئید آہ، پیشِ من مگوئید — کہ معشوقِ سگے عاشق نواز ست

مہتاب و شراب و انتظار ست! — ایں روز قیامت ست شب نیست

بیا بگرد دلم سیر کن کہ جائے خوش ست — خرابہ ایست ولیکن در و ہوائے خوش ست

امتحانِ صبرِ عاشق ایں قدر ہا خوب نیست — اے بقربانت روم آخر دلم ایوب نیست

عشق می گفت دمِ رخصتِ یوسف بہ پدر — خبرش نیست کہ در مصر زلیخائے ہست

اگر ز بندگی چوں منے ترا عار ست — تو زندہ باشش خریدار بندہ بسیار ست

غلام عشقم و لطف و کرم بہائے من ست — کسے کہ بندہ بخواند مرا خدائے من ست

کیست امروز بجز مظہرِ دیوانۂ ما — آنکہ ہر شب بہ تمنائے تو صد بار گریست

منم کہ شکرِ جفا از وفا زیادہ کنم — اگر ستم نہ کنی بر چنیں کسے ستم ست

قفس کے سدِ راہِ وحشتِ ما می تواند شد — ولیکن رحم بر تنہائیِ صیاد می آید

خدا سمیع و بصیر ست کے تواند دید — کہ من نباشم و کس با تو در سخن باشد

سینہ وا کردہ بگلشن چہ خراماں گزرد — بلبل از جاں گزرد، گل ز گریباں گزرد

رحم آیدم کہ با تو چساں پیش می رود — بیکس دلم، غریب دلم، بینوا دلم

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں — ہائے دشنام نا تمام کسے

نے فرصتِ اشکے نہ مرا رخصتِ آہے — دارم بہ رخِ دوست غریبانہ نگاہے

مکتوبات نیاز

تیسرا حصہ

ادب و انشاء کا معجزہ، علمی و تنقیدی لطائف کا بیش قیمت مجموعہ، بہترین فارسی و اردو اشعار کا گلدستہ ۲۰ پونڈ کا چکنا کاغذ، نہایت نفیس طباعت و کتابت، خوبصورت جلد اور گرد پوش، حضرت نیاز کی تصویر کے ساتھ شایع ہوگیا ہے - قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

آنسو

"ابے او رامو کے بچے، سنتا نہیں؟ بابو کو پانی دے"۔ پنڈت نے چلا کر کہا۔

اُس نے اُٹھ کر نل کے پاس جاکر گلاس دھویا، اور پانی سے بھر کر، بابو کے پاس رکھ دیا، پھر برتن مانجنے میں محو ہوگیا پنڈت نے پھر شور مچایا "ابے تھالیاں کیوں نہیں لاتا؟" اب وہ منجی ہوئی تھالیاں لے کر اُٹھا، اور انھیں نل پر دھوکر پنڈت کے پاس رکھ آیا۔ لیکن ابھی برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ پھر آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

اُس کا سفید اور گورا رنگ راکھ کی کالک نے چھپا رکھا تھا۔ چہرے پر اس کالک کے دھبے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ اسکی قمیص کندھوں کے اوپر سے پھٹی ہوئی تھی اور بازو کے پاس سے لٹک رہی تھی۔ جب زکام کی زیادتی سے ناک کی رطوبت بہنے لگتی، تو وہ لٹکتے ہوئے قمیص کے ٹکڑے سے اسے صاف کرلیتا۔ رطوبت کی لکیر کان تک آپہنچتی اور اس پر کالک جم جاتی۔

راکھ کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے، اس نے جھوٹے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا اور ان میں سے کٹوریاں چھانٹنے لگا، کیوں کہ پنڈت نے اب یہ طلب کی تھیں۔ جھوٹے آلوؤں کو وہ نالی میں پھینک دیتا اور پھر ان کٹوریوں کو راکھ سے ملتا۔ رامو کے باپ کی اپنی زمین تھی جس میں وہ سبزی اور اناج پیدا کرتے تھے۔ گاؤں سے ٹوکروں میں آلو ڈال کر، اس کا باپ اور بڑا بھائی گلاب، پانچ میل کا فاصلہ طے کرکے شہر جاتے۔ واپسی پر تھوڑے پیڑے یا جلیبیاں لاتے۔ کبھی کبھی جب اسے بھی شہر جانے کا موقعہ نصیب ہوتا تو وہ بھی ہری رام حلوائی کی دوکان سے ایک آنہ کی ریوڑیاں لیتا اور ان میں سے آدھی لاکر شوبھا کو دیتا۔ گاؤں میں آم کا ایک بڑا درخت تھا، جو برسات میں آموں سے لدا جاتا وہ، اس کے دونوں چھوٹے بھائی کیسر اور جسا، اس کا ساتھی نندو اور بہاری کی لڑکی شوبھا، اکٹھے مل کر آم کے پیڑ پر حملہ کرتے۔ وہ کچے آموں تک کو نہ چھوڑتے تھے۔ نندو کی بانسری شوبھا کو بہت بھاتی تھی۔ جب چشمے کے کنارے، شوبھا کہتی "نندو، ماہیا گاؤ"، تو رامو کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ بانسری چھین کر نندو کے ہونٹوں پر توڑ دے اور آئندہ کے لئے اسے بالکل بیکار کردے۔ بچپن سے اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح شوبھا کو خوش رکھ سکے۔ اس کے منہ پر مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دل کھِل اُٹھتا تھا لیکن شوبھا ہمیشہ بانسری کے لئے بیتاب رہتی۔ رامو سوچتا کیوں نہ وہ بانسری خریدے اور بجانا سیکھے۔ لیکن پیسے کہاں سے لائے؟ نندو کا باپ اس کے باپ سے زیادہ امیر تھا۔ تبھی تو اس نے بانسری خریدی تھی۔ پھر سیکھے گا کہاں؟ نندو سے وہ ہرگز نہیں کہے گا۔ اپنے رقیب سے بھلا وہ ایسی التجا کیسے کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے دل میں پختہ تہیہ کرلیا کہ وہ بانسری

وہ ننددو کو مات دے گا اور اسے نیچا دکھائے گا۔ نندوے کے رویہ نے اس کے دل میں اس کے خلاف، انتقام کے شعلوں کو بھڑکا دیا تھا۔

ساون کے شروع میں، شہر میں ایک بھاری میلہ لگتا۔ گرد و نواح کے دیہات سے لوگ میلہ دیکھنے آتے اور اس کے گاؤں کے لوگ بھی وہاں پہونچتے۔ بچوں کو خرچ کرنے کے لئے پیسے ملتے، لیکن رامو مٹھائی خرید کر خود نہ کھاتا، شوبھا کے لئے رکھ لیتا۔ ایک دن جب اس نے شوبھا کو مٹھائی دی، تو وہ پہلے کی طرح خوش نہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر غم کے آثار دیکھ کر وہ گھبرا اُٹھا۔ رامو نے پوچھا "کیا میلے میں کسی نے تجھے چھیڑا تھا، کیا کسی نے سخت الفاظ کہے تھے؟"

"تم دیکھتے نہیں ہو، رامو" وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی "وہ لڑکی جو چشمے کے پاس بیٹھی ہے، اس کے (بندے) کتنے خوبصورت ہیں۔"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"نہ جانے مجھے بھی ایسے خوبصورت بندے نصیب ہوں گے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں؟" اس نے بے ساختہ کہا

"کیا آسمان سے آئیں گے؟"

"آسمان سے کیوں؟ میں لا کر دوں گا!"

"تم!" وہ اس کی بات کو ناقابلِ یقین تصور کرکے، حیرانی سے بولی۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے"

"جاؤ جی" وہ لاپرواہی سے بولی۔ "یہ بھی کوئی پھلگو کے آم ہیں؟ ان کے لئے روپیہ چاہئے اور تمھارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

کتنے تلخ الفاظ تھے، لیکن سچائی سے پُر۔ اسے اپنی بے بسی پر غصہ آگیا۔ شوبھا کو خوش رکھنے کے لئے وہ آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ کے لئے وہ اپنی جان قربان کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کتنا بدنصیب تھا کہ اس کی ایک ادنے سی خواہش پوری کرنے کی بھی سکت اس میں نہ تھی۔ اسے اپنی کمزوری پر رحم آگیا۔ کاش اسے ایک قوتِ بے پناہ میسر ہوتی۔ اور وہ میلے کی تمام عورتوں کے گہنے چھین کر، انھیں اپنی شوبھا کی نذر کر سکے۔

ہرگنی کی خوبصورت آنکھوں سے بہتے ہوئے بڑے بڑے آنسوؤں نے، اُس کے دل میں ایک تلاطم بپا کر دیا اُس کے دبے ہوئے احساسات سطح پر ابھر آئے، اس کے چھپے ہوئے جذبے، آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے دل کے اندر بہت سے جذبے جاگ رہے ہوں، لغزش کھاتے ہوئے ارادے سنبھل رہے ہوں اور بڑھتے ہوئے ولولے جوان ہو رہے ہوں۔ ایک ہی جذبہ اس کے دل پر غالب تھا، ایک ہی خیال اس کی روح پر قابض تھا

اچانک اس کے دل کی لہروں میں ایک طوفانی ہیجان بپا ہوا اور اس نے سینہ تان کر کہا:

"شونبھا - میں تمھاری خواہش پوری کروں گا۔"

"کیا کہا رامو؟" جیسے وہ خواب سے چونک کر بولی۔

"ٹھیک کہتا ہوں!"

"لیکن کیسے؟"

"تمھیں اس سے مطلب؟"

"کیا چوری کرو گے؟"

"چھی - چھی - بھلا چوری کیوں کروں گا؟ - کیا میرے ان بازوؤں میں طاقت نہیں؟ میں کما کر لاؤں گا"

اس کے بعد وہ شہر چلا گیا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی پیٹھ پر لوہے کے ہتھوڑے چل رہے ہیں اور وہ ان کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، پنڈت تڑاتڑ مکوں کی بارش اور گالیوں کی بوچھار کر رہا تھا۔

"اُلّو کا پٹھا! کیا رات کو آگ بجھا رہتا ہے جو اسوقت سو رہا ہے؟ اتنی آوازیں دیں اور تو سنتا ہی نہیں! کتنے گاہک کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں اور تو مزے سے خواب دیکھ رہا ہے! حرامی - اگر کام نہیں کر سکتا تو گھر جا کر ماں کے پاس سو رہ۔"

وہ واقعی قصوروار تھا جو کام کرتے کرتے سو گیا تھا۔ لیکن وہ رات کو بھی کب چین سے سو سکتا تھا۔ بمشکل تمام وہ رات کو دو بجے کام سے فارغ ہوتا اور پانچ بجے صبح بنیا باورچی گالیاں دیکر اور لاتیں مار کر اسے جگا دیتا اور پھر سارا دن کا کام - ملک الموت کی طرح پنڈت اس کے سر پر سوار رہتا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، میلی قمیص اور گندی دھوتی پہنے، وہ غلاظت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ لیکن سانڈ کی طرح پلا ہوا - اس کی آواز میں گرج تھی اور اس کے تمام نوکر اس سے خائف رہتے۔ وہ ایک ٹین کے ڈبے میں سے گھی نکال کر ایک لوہے کے کڑچھے میں ڈالتا اور اس میں کٹی ہوئی پیاز ملا کر آگ پر رکھ دیتا۔ اس کے میلے ہاتھوں کی زد میں آکر پیاز اور بھی غلیظ ہوجاتی منڈیر پر دو بڑے برتنوں میں دال اور سبزی تھی - کڑچھے سے دال اور سبزی نکال کر وہ دو کٹوریوں میں ڈالتا - کچھ دیر کے بعد وہ گھی اور پیاز کٹوریوں میں انڈیل دیتا - اس عمل سے ایک آواز پیدا ہوتی اور پنڈت کی کرخت آواز سے بھی زیادہ دلخراش ہوتی - لیکن وہ ان دونوں آوازوں کا عادی ہو چکا تھا - دونوں کٹوریوں کو اُٹھا کر وہ تھال میں رکھ دیتا، اور کٹی ہوئی پیاز کے کچھ ٹکڑے تھالی میں رکھ کر وہ آواز دیتا "بابو ڈانگی رام"

اور بھیمن اس تھالی میں راکھ سے بنی ہوئی دو روٹیاں رکھ کر بابو ڈانگی رام کے آگے رکھ دیتا۔ ایک طرف سے

آواز آتی "پانی" - پنڈت چلا کر کہتا: "چل بے رامو کے بچے بابو چیلا رام کو پانی دے"

پھر آواز آتی "چپاتی" اور پنڈت پھر چلاتا — "سردار روپ سنگھ کو روٹی دے" پھر ہیک والے بابو سیتارام کی آواز بلند ہوتی - "پنڈت جی - پانی بہت گرم ہے - دو پیسے کی برف تو منگوا دو"۔ اور رامو دو پیسے کی برف لینے چلا جاتا - لوٹنے پر پنڈت کی گالیاں بے تابی سے اس کا انتظار کرتیں۔ وہ چاہے کتنی ہی جلدی کیوں نہ لوٹ آئے پنڈت گالی دئے بغیر نہ رہ سکتا - گالیاں اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھیں۔ سانس لیتے وقت بھی وہ گالیاں چھوڑتا جیسے ایسا نہ کرنے سے دنیا میں قحط پڑ جانے کا خدشہ تھا۔

پنڈت کے ہوٹل کے ساتھ ملا ہوا ایک مکان تھا جو اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ کالج کے لڑکے جو ہاسٹل کے اخراجات برداشت نہ کر سکتے، اور دفتروں اور بینکوں کی کم تنخواہ والے ملازمین، وہاں قیام کرتے۔ ایک ایک کمرے میں چار یا پانچ بابو پڑے رہتے اور اونچے درجے والوں کے سلوک سے چڑے ہوئے، یہ لوگ اپنا غصہ ہوٹل کے غریب اور بےبس نوکروں ہی پر نکالتے۔ اس لذت کا احساس کہ رعب جمانے اور احساس برتری، دکھانے کے لئے سماج میں ان سے بھی نیچے درجے کے لوگ موجود ہیں، انھیں پاگل بنائے رکھتا۔ اپنی معمولی حیثیت کی پروا نہ کرتے ہوئے، وہ ہوٹل میں شان سے رہنا چاہتے۔ اس شان کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کھانا کمرے میں منگواتے۔ اس کام کے لئے رامو ہی تعینات تھا۔ اس کا کام ضرور بڑھ جاتا لیکن اسے اس کا معاوضہ کبھی نہ ملتا۔ گرمیوں میں اس کی شامت آجاتی۔ دوپہر کے وقت ننگے سر ننگے پاؤں، دونوں ہاتھوں سے گرم تھالی سنبھالے، وہ بابو لوگوں کے کمروں میں جاتا۔ وہاں اسے پانی لانے کا حکم ہوتا، پھر برف لانے کا۔ جب روٹی ختم ہو جاتی تو روٹی کے لئے، جب دال ختم ہو جاتی تو دال کے لئے دوڑنا پڑتا۔ اس پر بھی بابو لوگ خوش نہ رہتے۔ وہ اکیلا تھا اور کھانا کھانے والے کئی۔ سب کو خوش رکھنا ناممکن تھا اس لئے گالیاں سننا اور جھڑکیاں کھانا ناگزیر تھا اور کوئی کوئی بابو اپنے غصے پر قابو نہ پا کر ایک آدھ چپت بھی رسید کر دیتا۔ وہ کچھ نہ کہتا۔ لیکن پنڈت پھر بھی ناراض رہتا۔ کمروں میں اتنی دیر لگانے کا کیا مطلب؟ ہوٹل پر بھی تو گاہکوں کو بھگتنا تھا۔ کیا یہ کام اس کا باپ کرتا؟۔ کیا کمرے والے بابو روٹی کے زیادہ پیسے ادا کرتے ہیں؟۔ پنڈت ان کو تو کچھ نہ کہہ سکتا۔ لیکن سارا غصہ رامو پر نکالتا اور پھر بھی خاموش رہتا۔

پنڈت کو اس بات کی خاص شکایت رہتی کہ وہ دوسرے کاموں میں بھینس کو بھول جاتا۔ جب وہ جانتا تھا کہ یہ ایک دن کا نہیں بلکہ روز کا کام ہے تو وہ اس میں کوتاہی کیوں کرتا تھا؟۔ اگر وہ اس کام میں غفلت دکھائے تو وہ دودھ کیا خاک دے گی؟ اور دودھ کے خریداروں کو کتنا مایوس ہونا پڑے گا۔ گاہکوں کو روٹی ملنے میں دیر ہو جائے یا ہوٹل کا ذرا سا ہرج ہو تو وہ برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن بھینس کی خدمت میں غفلت کو وہ ہرگز ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ غرض اس معاملے میں وہ اسے کبھی بھی معاف نہ کر سکتا تھا اور عموماً اپنے غصہ کو مکوں کے ذریعہ ہی سے نکالتا۔ اب اسے اس

بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ پنڈت کا کام اسے پیٹنا ہے اور اُس کا کام چپکے سے مار کھانا۔ اور کہ تنخواہ اور روٹی کے عوض پنڈت کو اس کے جسم پر پورا حق حاصل ہے۔ وہ شاید اس فیصلے کو منظور کرنے سے انکار کر دیتا۔ لیکن اسے اپنے وعدہ کا پاس تھا۔ شوبھا کی آنکھوں سے نکلے ہوئے بڑے بڑے آنسو ہمیشہ اس کے سامنے تیرتے رہتے۔

اُس کی اِن خدمات کے عوض، اسے ہوٹل سے دونوں وقت پکا پکایا کھانا ملتا۔ جب سب گاہک کھا چکتے تو اُسکی باری آتی۔ موٹی موٹی خشک روٹیوں کے ساتھ، بچی کھچی دال سبزی سے اسے پیٹ بھرنا ہوتا۔ بعض اوقات کچھ بابو دیر سے آتے اور کھانا مانگتے تو پنڈت بچی کھچی دال سبزی بھی انھیں کے نذر کر دیتا اس لئے رآمو کو کبھی کبھی بغیر ترکاری کے خشک ٹکڑے چبانا پڑتے۔ وہ اچار نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اچار تو بازار سے مول آتا تھا اور صرف بابو لوگوں کے استعمال کے لئے مخصوص تھا۔

اُسے ملازم ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ اس نے حساب لگایا، پنڈت کے پاس اس کے ایک سو چالیس روپے، جمع ہو چکے تھے۔ اسی اثنا میں اُس نے صرف دس روپے لئے تھے۔ ان روپوں سے اس نے اپنی شوبھا کے لئے تحائف خریدے تھے۔ جب کبھی وہ بازار جاتا اور چوڑیوں پر اس کی نظر پڑتی تو اگلے دن وہ پنڈت سے پیسے مانگ کر ان چیزوں کو خرید لاتا۔ یہ اُس کے اپنے پیسے تھے لیکن پھر بھی وہ سخت ہچکچاہٹ کے ساتھ اُن پیسوں کو مانگتا۔ پنڈت بھی پیسے دیتے وقت بہت لیت ولعل کرتا۔ وہ ان چیزوں کو سنبھال کر لکڑی کے ایک چھوٹے بکس میں رکھ لیتا۔ یہ بکس اور ایک چھوٹا سا تالا اس نے سستی قیمت پر بازار سے خریدا تھا۔ کام کے دوران میں وہ کئی بار کمرے میں جا کر دیکھتا کہ صندوقچی کو کسی نے اُٹھا نہ لیا ہو یا کسی نے اس کا تالا نہ کھول لیا ہو۔ اسے چھمن پر شک رہتا کیونکہ پنڈت کے تمام نوکروں میں وہ اس سے خار رکھتا تھا۔ چھمن کی مرمت کرنے کے اس نے دل میں کئی بار منصوبے باندھے تھے لیکن ایک نامعلوم خوف اسکے راستہ میں مانع رہتا۔ وہ صرف اس کی نگاہوں میں غضب آلود نگاہیں ڈال کر خاموش رہ جاتا جیسے اسے جتلا رہا ہو کہ ایک دن اس کی آنکھوں کے شعلے، اس کے ہاتھوں میں اُتر کر، اس کے گالوں کو ضرور سرخ کریں گے۔

ایک دن اپنے گاؤں کے ساتھی رآنو کو پنڈت کی دوکان پر کھڑا دیکھ کے وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہ کر سکا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا، دل میں ہزاروں سوال اور لاکھوں تمنائیں لئے۔ لیکن پنڈت کی گندی گالی اور کرخت جھڑکی نے اسکے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔

"کیا تمھیں خبر نہیں کہ بازار سے بھینس کے لئے ابھی بنولے لانے ہیں" وہ گرج کر بولا۔ آج اسے پہلی بار پنڈت پر غصہ آیا۔ اس کے دل میں اُبال اُٹھا۔ وہ اسے صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ رآنو سے ملنے کے بعد بازار جائے گا لیکن الفاظ زبان پر آ کر رک گئے۔ پنڈت کی گرج اس کے کانوں میں پھر گونجی۔ "سور کا بچہ، کھڑا کیا دیکھتا ہے؟ کیا بہرا ہے؟" وہ چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ آج اسے پہلی بار اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور پہلی بار اس کے دل میں پنڈت کے خلاف صدائے احتجاج کا دھواں بلند ہوا۔ کیا اسے رآنو سے ملنے کا بھی کوئی حق نہ تھا۔ نہ جانے وہ گاؤں سے کیا کیا خبر لایا تھا

اس کے اپنے گھر کی۔ گاؤں کی اور شوبھا کی۔ کتنی بے تابی سے وہ اُس کا انتظار کرتی ہوگی! روزمرہ اس کی راہ تکتی ہوگی۔ اچانک اسے دھکا لگا۔ ہیٹ اور سوٹ پہنے ایک بابو اسے گالیاں دے رہا تھا "سور، اندھا ہوگیا ہے؟ دیکھ کر نہیں چلتا ؟" وہ سنبھل کر چلنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ اُس کو بھینس کے لئے بنولے لانا ہیں۔ کاش وہ بنولوں کی جگہ زہر لے آتا۔ آدھی بھینس کو اور آدھی پنڈت کو کھلا دیتا۔ جب زہر کھا کر پنڈت تڑپتا تو وہ اس کی چھاتی پر بیٹھ کر اسکے گالوں پر گھونسوں کی بارش برساتا۔ مکوں کی شدت کی وجہ سے اس کے منھ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلتا۔ وفورِ مسرت سے وہ ناچنے لگ جاتا اور چلا کر کہتا:

"اے دنیا والو، آج میں کتنا خوش ہوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ سچی راحت کا احساس حاصل کرنے کے لئے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنا ازحد ضروری ہے۔ اگر سکھ چاہتے ہو تو بدلہ لینے سے مت چوکو۔ اپنے دشمنوں کے خون کے فوارے چھڑا دو۔ اگر پھر بھی کسر رہے تو اُس خون کے کچھ گھونٹ حلق کے نیچے اُتار لو۔ ایسا کرنے سے تمھیں اسی دنیا میں جنت کے مزے نصیب ہوں گے"

جب وہ ہوٹل لوٹا تو راَنو سبزی کاٹ رہا تھا۔ پنڈت کے پاس ایک نیا شکار پھنسا تھا۔ اسے رانو سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ پنڈت پاس بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ کاش وہ پنڈت سے حقہ چھین کر چلم کی آگ سے اس کی مونچھیں اور بھوؤں کے لمبے بال جھلس دیتا۔

شوبھا کی خبر سُننے کے لئے بے قرار تھا ——————— رات کو رانو سے پتہ چلا کہ اس کا بڈھا دادا مر گیا تھا۔ ایک گائے بھی چل بسی تھی۔ اس کی ماں ہر وقت اس کی یاد کرتی اور دوسری عورتوں سے بات کرتے وقت آنسوؤں کی جھڑی لگا دیتی۔ سندو کی شادی ہو چکی تھی۔ شوبھا ابھی زندہ تھی۔ اُس کے آنے کے چار ماہ تک تو وہ خوش و خرم رہی۔ لیکن اس کے بعد کسی نے گاؤں میں خبر اُڑا دی کہ راموندی میں چھلانگ لگا کر مر گیا ہے۔ اس خبر نے اُس کے دل کو ہلا دیا اور وہ مغموم رہنے لگی۔ اس کے والدین نے اُس کی شادی رچا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ، لعنت ملامت اس پر کچھ اثر نہ کر سکے۔ جب بات طول پکڑنے لگی تو اس نے چھ مہینے کی مہلت مانگی۔ اسکا والد تو بضد تھا لیکن ماں اور دادی نے اس کو سمجھا کر چھ ماہ انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اس کی حالت اب دگرگوں رہتی تھی اور اگر ایسا ہی رہا تو اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

اس خبر نے اسے تشویش کی گہرائیوں میں ڈھکیل دیا۔ غم کا پہاڑ اس کے سر پر گر پڑا۔ رانو نے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن اس کا دھیان صرف ایک ہی بات پر مرکوز تھا۔ شوبھا کی بیماری کی خبر نے اسے ادھ موا سا کر دیا۔ لیکن وہ اس خیال سے خوش بھی تھا کہ شوبھا اس سے محبت کرتی تھی۔ اسے اپنے اوپر فخر محسوس ہونے لگا۔ وہ خوش تھا کہ شوبھا صرف اسی کی ہے اُس کے دل پر دوسرے کسی کا قبضہ نہیں۔ سندو اُس کے راستے میں حائل تھا۔ لیکن اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اب میدان صاف

تھا۔ وہ اُس ست سنے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ اس نے پیسے بھی کمائے تھے، اس نے سوچا اگلے دن وہ پنڈت سے پیسے لے گا۔ بازار سے ایک خوبصورت بُندوں کی جوڑی اور ایک نفیس ریشمی ساری خریدے گا اور ان کے ساتھ دوسرے تحائف کو لے کر وہ سیدھا گاؤں روانہ ہو جائے گا۔ سب سے پہلے وہ شوبھا سے ملے گا۔ اُسے دیکھ کر شوبھا کو اپنی آنکھوں پر ہرگز ہرگز یقین نہ آئے گا۔ اچانک اسے دیکھ کر وہ سکتہ میں رہ جائے گی۔ وہ اسے چشمے کے کنارے لیجائے گا۔ سب سے پہلے وہ ریشمی رومال اس کی نذر کرے گا۔ پھر صندوقچے سے ساری اور بُندوں کی جوڑی نکال کر اس کو دے گا۔ وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے گی دوسرے تحائف کو دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔ اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ وفورِ جوش سے پکار اُٹھے گی "راجو۔ تم کتنے اچھے ہو!" صرف اسی نعرے کو سننے کے لئے اس نے گھر بار چھوڑ کر مصائب بھرے شہر میں رہنا منظور کیا تھا۔ ان الفاظ کی گونج اس کے دل کا ایک ایک تار ہلا دے گی۔ اس کی رگ رگ میں ایک مدھر گیت کی الاپ گونج اُٹھے گی۔ اس کا انگ انگ ایک سہانے سُر سے بھرپور ہو جائے گا ـــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــ گرد و نواح کے پہاڑوں میں بھی صرف ایک ہی نغمے کی گونج سنائی دے گی۔ چشمے کے پاس اور مرغزار کے بیچ، وہ شوبھا کے قدموں پر سر رکھے لیٹا ہوگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی ناگن سی کالی زلفوں سے چھیڑ کر رہے ہوں گے وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ان لانبے لانبے بالوں کو اس کے منہ پر سے ہٹائے گا۔ کاش وہ اُڑ کر چشمے کے کنارے پہونچ جائے لیکن ابھی اُس کو پنڈت سے پیسے لینے تھے

اگلے دن علی الصبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پنڈت بہت متعجب ہوا وہ بیداری کے بعد چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اس نے لحاف ابھی تک اوڑھ رکھا تھا۔ پلنگ کی پُرانی چادر میں بل پڑنے کی وجہ سے نیچے کی گندی چوتھی نظر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی دوسری چارپائی بچھی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہو۔ ایک کونے میں لکڑی کا ایک صندوق پڑا تھا جس میں ایک بڑا تالا لٹک رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک قد آدم شیشہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف کرشن جی کی تصویر تھی، جس پر جالا لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک کیلنڈر تھا جس میں فلمی ایکٹرسوں کی تصاویر تھیں۔ دائیں دیوار پر لیڈروں کی تصاویر والا ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ بائیں طرف دیوار پر ایک خنجر لٹک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پنڈت کی بھویں تن گئیں اور گرج کر بولا:

"کیوں بے سُور، صبح صبح کیوں آمرا ہے؟"

آج پنڈت کی آواز سُن کر اس کے دل میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی، اور نہ اس نے نیچی نگاہیں کر کے زمین کریدنے کی کوشش کی۔ اس نے گردن کو اونچا کر کے کہا:

"میں گھر جا رہا ہوں"

"کیا کوئی مر گیا ہے؟" پنڈت نے جسم تان کر کہا۔

"کیا لوگ صرف اسی وجہ سے گھر جاتے ہیں؟"

"کیا بکتا ہے! جا - اپنا کام کر" پنڈت نے خشم آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کام کرنے ہی آیا ہوں" اس نے توازن قایم رکھتے ہوئے کہا "میں گھر جا رہا ہوں، میرا حساب کر دیجئے۔"

پنڈت کو گویا شہد کی مکھی نے ڈس لیا۔ اسے یہ سوال بالکل غیر قدرتی معلوم ہوا۔ اس نے لحاف کو ایک طرف پھینک دیا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکالتے ہوئے بولا:

"سور کے بچے - یہ کوئی حساب کا وقت ہے؟"

نہ جانے کتنی بار اُس نے اِس گالی کو سنا اور ہضم کیا تھا - آج بھی ہضم کرتے دیر نہ لگی - بولا:

"اور کس وقت آؤں؟"

"میں اس ماہ حساب نہیں کر سکتا - اگلے ماہ دیکھا جائے گا۔"

اس جواب نے اُسے خوفزدہ کر دیا - ایک ماہ تو کیا وہ ایک دن بھی انتظار نہ کر سکتا تھا وہ اُڑ کر اپنے گاؤں پہونچ جانا چاہتا تھا - ایک ماہ اس کے لئے ایک جُگ کے برابر تھا - اگر سچ مچ پنڈت اپنی بات پر اڑ گیا؟ اس خیال نے اسے لرزاں کر دیا - وہ اُس کے سامنے گڑگڑانے لگا - اس نے ہزار منتیں کر ڈالیں - لیکن پنڈت ہر منت کا جواب گالی سے دیتا - تب وہ گالیاں دے کر بھی تھک گیا اور تنگ آ کر بولا "وقت ضایع نہ کر - جا کر اپنا کام کر - میں نے ابھی اشنان بھی نہیں کیا۔"

——— اب رامو کا عاجزانہ انداز بالکل معدوم ہو گیا - اس کا انکسار ایک دم غایب ہو گیا اور وہ تن کر بولا:

"لیکن پیسے میرے اپنے ہیں - یہ میری محنت اور دھرم کی کمائی ہے - میں انھیں لے کر ہی رہوں گا۔"

جیسے پنڈت پر گرم لوہے کی چوٹ پڑی، وہ تڑپ اُٹھا - ہونٹ بھینچ کر، مکہ تان کر گرسنہ بھیڑیے کی طرح وہ شکار پر پل پڑا - اسکے مکوں کی بارش نے رامو کو بے دم کر دیا - اچانک خون کی ایک بوند زمین پر ٹپکی اور رامو کی نظر سامنے والے شیشے پر پڑی - خون سے لتھ پتھ چہرہ، پر اس کے بال پراگندگی سے بکھرے ہوئے تھے - اس کا منہ سوجا ہوا تھا - آنکھوں کے اوپر ایک زخم ہو گیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا ——— کیا وہ اس گندی شکل کو لیکر شوبھا کے پاس جائیگا؟ اُسکی چھ ماہ کی محنت ضایع جا رہی تھی - اگر وقت گزر گیا اور اسے دیر ہو گئی تو شوبھا کسی اور سے شادی کر لے گی - اُس کی امیدیں دم توڑ رہی تھیں - اسکے شجرِ نخل آرزو کو ایک تند آندھی بڑھے ہلا رہی تھی - اگر وہ اس آندھی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے چوک گیا تو امید کی آخری شعاع بھی بجھ جائے گی - پنڈت اب بھی غصہ سے ہانپ رہا تھا - شاید وہ اسے مار ڈالنے پر ہی تلا ہوا تھا - نہ جانے رامو کو کیا سوجھی اس نے جھٹ اُٹھ کر کواڑ اندر سے بند کر دئے - اسکے بعد کمرے سے چیخیں بلند ہوئیں - گھر کے لوگ محلے کے آدمی اور ہوٹل کے سب نوکر باہر آ موجود ہوئے - دروازوں پر مکوں کی بارش ہو رہی تھی - اچانک دروازے کو چیرتی ہوئی، دلوں کو چیرتی ہوئی ایک پر درد چیخ کمرے سے باہر نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئی - ساتھ ہی دروازہ بھی کھل گیا - کمرے میں فرش پر پنڈت کا جسم خون سے تر تھا - جو اس کی گردن اور چھاتی سے تیزی سے بہہ رہا تھا - رامو ان ہی خون آلود خنجر پڑا تھا اور نیچی نگاہ کئے رامو کسی گہری سوچ میں مستغرق کھڑا تھا۔

ست پرکاش سنگر - ایم - اے

رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے - بیج ناتھ در آپ کے والد تھے - رتن ناتھ کو قدرت خاص اپنی سرپرستی میں لینا چاہتی تھی - لہذا عالم طفلی ہی میں باپ کا ظل عاطفت سر سے اُٹھ گیا - اس کے بعد ماں نے تعلیم و تربیت کا خیال رکھا - رسم زمانہ کے مطابق عربی، فارسی اور اُردو کی کتابیں پڑھائی جانے لگیں - ایک طرف تو یہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف قدرت آپ کو اس کام کے لئے طیار کر رہی تھی جو آیندہ چل کر آپ سے وقوع پذیر ہونے والا تھا - اس کی خاطر جتنی سہولتیں درکار تھیں قدرت نے بڑی فیاضی سے بہم پہونچائیں یعنے تیزیٔ طبع، ذہن رسا، اعلےٰ دماغ، بیدار دل، چشم بینا، قوت حافظہ، جودت وذکا - اس کے ساتھ عالی گہر مسلم خواتین کا پڑوس - جو سرشار کے ساتھ بڑی مہر و محبت سے پیش آتی تھیں اور اسی بنا پر وہ ان کے پاس بلا تکلف ہمیشہ جایا آیا کرتے تھے - ان مخدرات کی بات چیت، لباس طرز و روش، زیورات، طریق ماند و بود، محاورات، ہر ایک چیز قدرت کے اس لاڈلے کے لئے فردوس گوش اور جنت نگاہ تھی - جو دیکھتے ان کے لوح دل پر نقش ہو جاتا اور جو سنتے حافظہ کے خزانے کا ایک بیش بہا گوہر بن جاتا - ذاتی مشاہدات کا یہ سرمایہ ان کے پاس ایک ایسی عمر میں جمع ہونے لگا جب نہ تمیز ہوتی ہے نہ شعور - پھر وہ مستقبل میں کام آنے کے لئے ذہن کے احاطہ میں بحفاظت تمام باقی رہا - قدرت کی نوازش اسی کا نام ہے -

سرشار جب سن شعور کو پہونچے تو کیننگ کالج میں داخل ہوئے جو اسی اثنا میں قایم ہو چکا تھا - دو برس وہاں تعلیم پاکر پڑھائی ختم کردی مگر ڈگری حاصل نہ کرسکے - قدرت کا استاد جسے علم سے بہرہ ور کرے اسے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی ضرورت ہی کیا ہے - کیننگ کالج چھوڑ کر فکر معاش دامنگیر ہوئی تو کھیری کے ضلع میں کسی اسکول میں مدرسی کی خدمت پر مامور ہوئے - تنخواہ گو چالیس روپئے تھی مگر اس زمانے کے لحاظ سے یہ کوئی حقیر رقم سمجھی نہیں جاسکتی پھر پیشہ کی شرافت کے آگے انھوں نے قلیل آمدنی کا مطلق خیال نہ کیا - درحقیقت درس و تدریس کا یہ کام ان کو اس غرض منصبی کے لئے طیار کر رہا تھا جس کی خاطر وہ اس دنیا میں آئے تھے - کسی اور پیشے میں ان کے یہ جوہر نہیں کھل سکتے تھے - نچلی طبیعت نے انھیں مختلف رسایل و اخبارات کو مضامین روانہ کرتے رہنے کی طرف مائل کر دیا - چنانچہ مراۃ الہند، ریاض الاخبار، مراسلہ کشمیر، اودھ پنچ وغیرہ میں ان کے مضامین اشاعت پانے لگے - مضمون نویسی کے لئے انھوں نے اولاً فارسی زبان پسند کی لیکن بعد میں اُردو ہی کو انظہار خیال کا ذریعہ بنالیا - اسی اثنا میں سرشار کی انگریزی

کتاب کا ترجمہ بھی شمس الضحیٰ کے نام سے انھوں نے اُردو میں کیا۔ تعلیمات کے صیغے نے اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اکثر جگہوں، اس کی بڑی تعریف ہوئی۔ یہ وسائل ان کی شہرت کو چاروں طرف پھیلا رہے تھے اور وہ وقت قریب آرہا تھا جب کہ ایک خاص ذمہ داری ان پر عاید ہونے کو تھی۔

۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور کو ایک اخبار کے اجرا کا خیال آیا جس کا نام انھوں نے اودھ اخبار تجویز کیا۔ اسکے لئے انھیں ایک قابل اڈیٹر کی ضرورت تھی۔ آخر ان کی نظر انتخاب اُردو کے اسی انمول رتن پر پڑی جو اپنے ذاتی جوہر کو کئی مضامین کے ذریعہ ظاہر کرچکا تھا۔ نہیں معلوم منشی صاحب کی زبان میں کیا اثر تھا کہ اُدھر ان کی طرف سے خواہش کیگئی اور اِدھر سے لبیک کی صدا سنائی دی۔ پھر ملازمت کو ترک کرکے اودھ اخبار کی اڈیٹری کا قلمدان ہاتھ میں لے لیا گیا۔

اب سرشار گویا وہاں پہونچ چکے تھے جہاں قدرت انھیں رکھنا چاہتی تھی۔ اڈیٹری کی یہ خدمت انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔ کیونکہ یہ کام ان کی فطرت اور استعداد کے عین مطابق تھا۔ اخبار کو مقبول بنانے میں انھوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ اسی غرض سے ضمیمہ کے طور پر ایک افسانہ کی بنیاد ڈالی جو فسانۂ آزاد کے نام سے شایع ہونے لگا۔ اس افسانہ کے باعث اودھ اخبار اتنا ہردلعزیز ہوگیا کہ اس کی خریداری بڑھ گئی، اس کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر بعض حاسد جل گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ دس بیس قسطوں کے بعد افسانہ کا مواد اور افسانہ دونوں ختم ہوجائیں گے۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ افسانہ موجیں مارتا ہوا ناپیداکنار سمندر ہے اور اسکا سلسلہ معشوق کی زلف دراز کی طرح طولانی ہے۔ غرض سال بھر یہ افسانہ قسط وار شایع ہوتا رہا۔ اس کے باوجود نہ اسکی دلچسپی میں فرق آیا نہ اس کی مانگ کم ہوئی۔ اس بنا پر اس کی مختلف اور منتشر کڑیوں کو اکٹھا کرکے کتاب کی صورت میں شایع کیا گیا۔ گو یہ کتاب بڑی تقطیع کی ایک ضخیم جلد کم و بیش پانسو صفحات پر مشتمل تھی پھر بھی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ افسانہ کو کتابی صورت میں شایع کرنے کے معنے یہ نہیں تھے کہ افسانہ ختم ہوچکا تھا۔ یار سلامت اور صحبت باقی تھی۔ سالہا سال تک اس افسانہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں حاسد اور مخالف اسے ختم کردینے کے لئے کئی تدبیریں سوچنے لگے۔ طعن تشنیع، تعریض و طنز بلکہ فحش و دشنام سے بھی نہیں چوکے۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔ دور زماں دشمن ہوکر کچھ نہیں کرسکا افسانہ اور افسانہ نگار کی ہستی کے نہ مٹنے میں کچھ بات ضرور تھی۔ افسانہ اتنے عرصہ تک جاری رہا کہ اس کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کے باعث اسے پھر مستقل کتابی صورت میں شایع کیا گیا تو بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدیں مرتب ہوگئیں جن کے مجموعی صفحات دو یا ڈھائی ہزار سے کم نہ تھے۔

اتنے دلچسپ اور طول وطویل افسانے کے متعلق ہر کسی کو یہی خیال گزرتا ہے کہ بڑے غور و خوض اور کافی احتیاط سے لکھا گیا ہوگا مگر معاملہ برعکس ہے۔ سرشار تو غافل شعار اور تساہل پسند تھے۔ افسانہ لکھنا اس وقت تک شروع نہیں کرتے تھے جب تک کہ پریس کا آدمی آکر ان کی دہلیز پر نہ بیٹھ جاتا۔ اسی دم قلم کاغذ اُٹھاتے اور جلدی جلدی دو چار

صفحات لکھ کر ملازم کے سپرد کر دیتے۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ بے سوچے سمجھے جو چیز لکھی جائے وہ ٹھیکری اور کنکری کی طرح بے وقعت ہو گی مگر پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا کہ لعل و جواہر کی طرح گراں بہا ہے۔ مشہور ہے کہ جب یہ افسانہ ملک کے ہر گوشہ میں جب بہت مقبول ہو چکا اور معاوضہ کی موعودہ رقم مالک اخبار کے ذمہ کافی چڑھ چکی تو انھوں نے محمود غزنوی کی طرح کوتاہ دلی سے کام لینا چاہا۔ لیکن یہاں فردوسی نہیں بلکہ رتن ناتھ تھا اور پھر یہ بات کارنامے کے مکمل ہو جانے کے بعد کی نہ تھی بلکہ اس کے جاری رہنے کے وقت کی تھی۔ افسانہ نگار نے مالک اخبار کی بدنیتی کا بدلہ لیا اور خوب لیا۔ اس طرح کہ عین اس زمانہ میں جو داستان ہمایون فر سے متعلق تھی وہ اچانک ختم کر دی گئی۔ ناظرین اس سے دل شکستہ ہوئے اور ادھر اخبار کی خریداری کم ہو گئی۔ مالک اخبار چونک پڑے اور افسانہ نگار سے معذرت کی۔ پھر معاوضہ وعدے سے زیادہ ادا کیا تو ہمایون فر کی داستان کا سلسلہ از سر نو جاری ہوا۔ اس کے ساتھ اخبار کی خریداری بھی پھر بدستور بڑھ گئی۔

یہ افسانہ اس لئے فسانۂ آزاد کہلاتا ہے کہ وہ آزاد نام ایک شخص سے وابستہ ہے۔ وہی اس افسانہ کا ہیرو ہے۔ اس کا ایک رفیق اور یار غار خوجی ہے۔ دونوں بایکدیگر ہمیشہ سیر گشت میں محو رہتے ہیں۔ ملک خدا تنگ نیست — پائے گدا لنگ نیست کے مصداق ان کا گزر وقت اور مقام کا پابند نہیں۔ جب دیکھو کہیں نہ کہیں نکل گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن، کہسار، سیر و شکار، چوک بازار، کشتی کا دنگل، مکتب مدرسہ، پیر و مرشد کی صحبت، فقیر و مشایخ کا تکیہ، بازیگر کا تماشہ، مرغ باغی، شعر و سخن کی محفل، میخانہ، افیونیوں اور چانڈو بازوں کی مجلس، جہاز کا سفر میدان جنگ غرض ہر جگہ یہ دونوں پہونچتے ہیں اور وہاں کا مرقع پیش کرتے جاتے ہیں۔ ایسی ہی آوارہ گردی کے موقعہ پر ایک مرتبہ آزاد کو حسن آرا نظر آتی ہے جو اسم بامسمیٰ ہے ————

حسن آرا الھڑ اور گنوار لڑکی ————

نہیں بلکہ مہذب اور تعلیم یافتہ دوشیزہ ہے۔ حسینانِ جہاں کی طرح اپنے عاشقوں پر مشق ستم اسے منظور نہیں بلکہ وہ ان کی طرف مایل ہو سکتی ہے۔ وہ آوارہ مزاج نہیں بلکہ اصول کی پابند ہے۔ جو اس کے اصول کو نبھا سکتا ہے اس کی وہ قدر کرتی ہے اور اپنا دل اسے دینے میں مضایقہ نہیں سمجھتی، غرض دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو آزاد کو اولاً شیوۂ عشق کو مد نظر رکھ کر مایوسی اور حرماں نصیبی کا یقین ہو گیا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ حسن آرا پر قابو پانے کے لئے شرط صرف یہ ہے کہ ترکوں کی فوج میں داخل ہو کر روس کے ساتھ لڑنا اور مظفر و منصور واپس آنا ہے تو ان کا خشک کھیتی پھر ہری ہو گئی۔ عشق جس کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہو اس کے لئے جان پر کھیلنا نہایت آسان امر ہوتا ہے۔ آزاد اپنے محبوب کی رضا جوئی کے لئے نہایت مسرت سے قسطنطنیہ کو روانہ ہو جاتے ہیں اور بہت تھوڑی مدت کے بعد مہم کو سر کر کے واپس آتے ہیں۔ پھر بارگاہ حسن میں ازدواج کی درخواست پیش ہوتی ہے اور مراد بر آتی ہے۔

قصہ کا خاکہ تو صرف اتنا ہے لیکن اس کے اندر واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ اس کا لطف زبان قلم بیان نہیں کر سکتی۔ قصے کے اندر قصہ اور بات میں بات ایسی نکل آئی ہے کہ ہم اس افسانے کو پڑھتے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے سماں دیکھنے لگتے ہیں۔ اس میں اور دوسروں کے لکھے ہوئے افسانوں میں کسی کو زمین و آسمان کا فرق دکھائی دیگا۔ سرشار زبان کے رسیا ہیں۔ لطف زبان جو انھوں نے پیدا کیا ہے وہ خاص انھیں کا حصہ ہے پھر ان کے کردار بے حس مورتیں نہیں بلکہ متحرک تصویریں ہیں ایک۔ ایک مقام اور ہر ہر جگہ کا جایزہ لیکر آزاد داستان نہیں سنا رہے ہیں بلکہ مشرقی تہذیب و تمدن کے آخری نمونے کو موثر پیرائے میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ دو ڈھائی ہزار صفحوں پر پھیلے ہوئے افسانے کی حُسن و خوبی کو اس مختصر مضمون میں شمہ بھر بھی پیش کر سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین اس افسانہ سے بیگانہ نہیں۔ اُردو زبان اپنے اس انمول رتن کی برابر حفاظت کرتی رہے گی اور اُردو داں اس کے جوہرِ کمال کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے رہیں گے۔ دُنیا نظر انصاف سے دیکھے تو اُردو کا خزانہ کئی جواہر پاروں سے معمور دکھائی دے گا — چاند اور سورج میں داغ دکھائی دیتے ہیں تو انسان اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں میں کیسے نقص نہ ہو۔ فسانۂ آزاد جہاں بہتیری خوبیوں کا حامل ہے وہاں اس میں چند خامیاں بھی ضرور موجود ہیں سب سے پہلے پلاٹ کی بے ربطی ہے۔ پھر فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ کی باتیں جہاں آئی ہیں وہ خشک معلوم ہوتی ہیں اس کے علاوہ فسانہ کی ہیروئن، حسن آرا کو ایک شوخ و بے باک خاتون کی حیثیت سے پیش کرنا اُس وقت کی زنانہ تہذیب اور رسم و رواج کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ کہیں بعض الفاظ و محاورات کا استعمال غلط ہو گیا ہے۔ کسی جگہ واقعات کے تناسب کا خیال نہیں رکھا گیا اور آگے پیچھے کر دئے گئے ہیں، غرض یہ اور اسی قسم کے عیوب اس افسانے کے متعلق بتائے جا سکیں تو ان سے اس کی دل آویزی میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ کیونکہ ایسی چیزیں اس قدر کم ہیں کہ ہر کس و ناکس کو دکھائی نہیں دیتیں۔ پھر کونسا انسانی کارنامہ بے عیب اور مکمل ہے۔ بایں ہمہ جب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سرشار ہمیشہ قلم برداشتہ لکھ کر دیتے تھے تو جائے اعتراض اور بھی تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس حیرت ہونی چاہئے کہ اتنا جلد لکھ کر دینے والا زیادہ غلطیوں کا مرتکب کیوں نہ ہوا۔

سرشار کے اور بھی کئی کارنامے ہیں مثلاً خدائی فوجدار، جام سرشار، سیر کہسار، کامنی وغیرہ۔ ان کی زندگی کے آخری چند سال حیدر آباد میں بسر ہوئے۔ وہاں مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کی بڑی قدر کی اور دو سو روپئے ماہوار مقرر کر دیئے۔ پھر انعام و اکرام علحدہ۔ سابق حضور نظام بھی ان کے بڑے قدر داں تھے۔ غرض ۱۹۰۲ء میں انکا حیدر آباد ہی میں انتقال ہوا۔

میر محمود علی بادشاہ - ایم - اے

ترقی پسند ادب کی ایک جھلک

بیسویں صدی میں زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی ہے، ایک طرف زندگی کا پرانا نظام دم توڑ چکا ہے دوسری طرف کچھ ہلکے اور کچھ گہرے، کچھ حکیمانہ اور کچھ نیم حکیمانہ، کچھ مبہم اور کچھ واضح خطوط زندگی کے ایک نئے نظام کا خاکہ پیش کر رہے ہیں - میتھو آرنلڈ نے کہا تھا کہ ہم دو دنیاؤں کے درمیان رہ رہے ہیں جن میں سے ایک قریب قریب مر چکی ہے اور دوسری ابھی پیدا نہیں ہوسکی ہے مگر اب یہ خیال کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دوسری دنیا پیدا ہو رہی ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ روس میں پیدا ہو چکی ہے جس کی چھوٹ ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح ساری دنیا پر پڑ رہی ہے - ہماری نئی زندگی بہت وسیع، فراخ اور پھیلی ہوئی ہے مگر اس میں ایک وحدت اور مرکزیت بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے جو اس سے پہلے کہیں کسی اور دور میں نہیں ملتی - اس مرکزیت اور وحدت کا راز اس سچے اور گہرے انسانیت پرست فلسفہ میں مضمر ہے جو مارکس اور اینگلز کے دماغ کا نتیجہ ہے اور جسے انھوں نے ہیگل کی تصوراتی جدلیات اور فیورباک (Feuerbach) کی تجریدی اور مذہبی مادیت سے اخذ کر کے اپنے فکری اضافوں کے ساتھ پیش کیا - مارکسی جدلیات ہیگل کی تصوراتی جدلیات سے بالکل مختلف چیز ہے گو ان میں چند باتیں مشترک بھی ہیں - ہیگل زندگی کو ایک مستقل بہاؤ مانتا ہے، مگر خارجی دنیا کو وہ صرف اپنے تخیل کا مظہر سمجھتا ہے، یہیں سے مارکس کی فکر کا راستہ بدل جاتا ہے، وہ ہیگل کے اس خیال سے پورا اتفاق رکھتا ہے کہ زندگی نام ہے ایک استمراری بہاؤ کا جو مختلف اور متضاد عناصر کے تصادم سے ہر لمحہ نئی طرح صحت پذیر ہوتی رہتی ہے مگر وہ ہیگل کے اس خیال کا زبردست مخالف ہے کہ دنیا ذاتی تخیل کا خارجی مظہر ہے - مارکس کے نزدیک یہ خیال بالکل بے معنی، مہمل اور مضحکہ خیز ہے - وہ کہتا ہے کہ تخیل انسانی دماغ پر مادی دنیا کے اُن نقش کے سوا کچھ نہیں، جو خیالات کی شکلوں میں تبدیل ہو جائے - ظاہر ہے کہ عملی دنیا میں لا کر ہیگل کا تصور جدلیات صرف فضاؤں میں خیالی پرواز ہو کے رہ جاتا ہے لیکن مارکسی جدلیات اسی دُنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے جو ہماری زندگی، ہماری کائنات اور ہمارے تعلقات سے مانوس اور یگانہ ہے - ہمارے مادی وجود نے جو اقتصادی اور معاشی سہارے کے بغیر ایک لمحہ بھی قایم نہیں رہ سکتا فلسفیوں اور صوفیوں کی تجریدی اور ذہنی شعبدہ بازیوں کے فریب کا پردہ بری طرح چاک کر دیا ہے اور اچھی طرح بتا دیا ہے کہ مادی دنیا سے الگ رہ کر انسان محض تصوف اور روحانیت کے ہوائی قلعے بنانے کے بل بوتہ پر زندہ نہیں رہ سکتا مادی وجود کے اسی شدید اور گہرے احساس نے مجبوراً اور فطری طور پر انسانی ذہن کو مارکسی جدلیات اور مادیت

کی طرف منتقل کر دیا ہے اور وہ اب رومانی تخیلیت کے رنگ محل سے نکل کر سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ زندگی کے متعلق عملی طور پر سوچنے لگا ہے۔ اپنی آسانی اور سہولت کے لئے یہاں مارکسی مادیت اور فیور بیک کی مادیت میں جو فرق ہے اس کا اظہار کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ مارکس اور اینگلز مادیت (Materialism) کا ذکر کرتے وقت فیور بیک کا حوالہ دیتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا فلسفہ مادیت اور فیور بیک کا فلسفۂ مادیت ایک دوسرے کے مشابہ یا ایک ہی چیز ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ فیور باک کے فلسفۂ مادیت کی اصلی روح مارکسی مادیت میں ملتی ہے مگر بہت سی تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ۔ مارکس نے فیور باک کے فلسفے سے اس کی اصلی روح کھینچ کر اس کے خیالی اور مذہبی پیکر کو پس پشت ڈال دیا اور اُسے اپنے چند اضافوں کی مدد سے ایک نئی سائنسی، عملی اور حقیقی شکل دی۔ فیور باک جب مذہب اور اخلاق کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو اس کی مادیت روایت پرستی، تصوریت، تخیلیت اور تجریدیت کے طلسم میں بری طرح گرفتار ہو جاتی ہے۔ مارکس نے اس کے فلسفے سے اس روایت پرستی، تخیلیت اور تصوریت کو دور کر کے اور اس میں واقعیت اور جدلیاتی حقیقت کی آمیزش کر کے گویا اُسے از سرِ نو پیدا کیا ہے جو ایک بالکل نیا فلسفۂ مادیت ہے۔ اسی مارکسی جدلیات اور مادیت نے جن میں ایک ناگزیر تعلق ہے نئی زندگی میں سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور عمل کرنے کا طریقہ بدل کر رکھ دیا ہے اور زندگی میں ایک خاص مرکزیت، ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔

اب اس نئے زمانے اور اس نئی دنیا میں بسنے والا ایک ذہین، ذکی اور حساس انسان جو واقعی انسانیت کا حامی ہو صرف اپنے مفاد کی خاطر نہیں سوچ سکتا بلکہ اپنے گرد سماجی رشتوں اور اجتماعی تعلقات کی ایک مضبوط اور مستحکم دیوار کھڑی دیکھ کر ایسے کام کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو دنیا کے عام انسانوں کے حق میں کسی طرح مفید ثابت ہو بلکہ اُن کی زندگی میں عیش و عشرت، امن و سکون، خوشی اور رنگینی اور قوت اور بالیدگی پیدا کرنے میں ممد و معاون ہو سکے۔ اگر وہ صرف اپنے ذاتی اور انفرادی مسرتوں اور خوشیوں کے گھروندے بناتا ہے تو وہ اس پرولتاری اور جمہوری دور میں قائم نہیں رہ سکتے کیونکہ سماج کا قدم جو اجتماعی شعور کی رہنمائی اور سرکردگی میں بڑھ رہا ہے اُسے بے جان، نقصان دہ اور غیر صحتمند سمجھ کر توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ نئی سماجی اور اجتماعی زندگی دنیا کے سارے انسانوں کے لئے یکساں عیش و آرام اور امن و سکون فراہم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ بات کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی کہ چند افراد ساری دولت اور اقتصادی ذرائع پر قابض ہو کر اور اُسے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر اپنے ہی جیسے دوسرے کروڑوں انسانوں کا حق ماریں، انھیں اپنا دستِ نگر بنائیں، بے جا طریقوں سے ان پر حکومت کریں اور نتیجے کے طور پر انھیں بھوکا بھی رکھیں اور ننگا بھی۔ وہ چند اشخاص کو کروڑوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے نہیں دیکھ سکتی اور ظلم اور بربریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور دعوتِ انقلاب دیتی ہے۔ زندگی کی ان نئی قدروں کو دنیا کے دوسرے ادب کی طرح اُردو ادب نے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے، اور بڑی خوشی کی بات ہے

کہ اس میں کسی حد تک اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فنکاروں نے اپنے پیش نظر ادب کے اس نظریہ کو رکھ کر کہ ادب زندگی کا آئینہ بھی ہے، تفسیر بھی اور تنقید بھی (جس میں تخلیق بھی آجاتی ہے) اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ اُن میں اس زمانے کی سیمابی روح، بحرانی اور تشنجی کیفیت، انقلابی جرائت، دہشت انگیزی اور ہنگامہ خیزی، ایک نئے انسانیت پسند نظام زندگی کا تعمیری حوصلہ، فنی شعور سے بیگانگی، اور آرٹ سے ایک گہری محبت بھی مل جاتی ہے ہمارے ادیبوں میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو فن سے بے نیاز ہوکر اور صرف انقلاب اور اشتراکیت کا نام سطحی طور پر لے کر چیختے چلاتے ہیں، اکثر ایسے ہیں جو ذہنی حیثیت سے بہت بلند ہیں لیکن فن اور آرٹ کا احترام کرنا نہیں جانتے مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک بلند اور پر عظمت مقصد اور نظام فکر کو سامنے رکھکر سماجی، سیاسی، علمی بصیرت اور ایک پختہ فنی شعور کے ساتھ اپنے خیالات کو معرض اظہار میں لاتے ہیں پہلے دو قسم کے ادیب اور شاعر تو ظاہر ہے ہمارے ادب کے لئے مستقل خطرہ ہیں لیکن ایسے ادیب اور شاعر جو آخری گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی تعمیری قوتِ فکر، سماجی شعور، نفسیاتی اور سیاسی بصیرت اور فنی صلاحیتوں سے کام لے کر ادب میں زندگی کا کس بل، ابدیت، قوت، بیداری، علمیت، گہرائی، ادبیت، شعریت اور حسن پیدا کر رہے ہیں اور اس طرح نئے ادب کو ہمہ گیر، وسیع، تنوع، عمیق بنا رہے ہیں۔ اُن کے ہاں جلال و جمال اور موضوع و اسلوب کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن اسے زیادہ ہونا ہے اور اس کے لئے بڑی وسیع النظری، علمی بصیرت، تیز اور گہرے مشاہدے، تاریخ اور ارتقاء کے پختہ شعور اور حیرت انگیز فنی صلاحیت کی ضرورت ہے جو عرق ریزی اور جانفشانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس ادب کی ایک بہت بڑی خصوصیت ادبیت کے علاوہ اس کی انسانیت پرستی ہے۔ اس میں صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیائے انسانیت کا دل دھڑک رہا ہے۔ ایسے نازک اور انقلاب انگیز دور میں بھی ایسے ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں جو خواب کی دنیا میں پناہ لے کر انفرادیت کی بستی بسا کر فسطائی طاقتوں اور سرمایہ داروں کے گیت گا کر اور دوسرے نئے اور پُر فریب طریقوں سے رجعت پسندی کی کمر مضبوط کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر زندگی کے مقابلہ میں انکی مثال ویسی ہی ہے جیسے کچھ آدمی مل کر چلتی ہوئی ٹرین کو اپنے بازوؤں کے زور سے روکنا چاہیں۔ زندگی اور اسی کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر ادب ٹرین کی طرح دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ انھیں چند رجعت پسند ادیبوں اور شاعروں کا اپنی ادبی تخلیقات کی طاقت سے روکنا ایک فعل عبث یا احمقانہ حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ایسے ادیب اور شاعر اپنی موت آپ مر جائیں گے، ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہاں اُن کی ملمع سازی، بہروپ اور فریب کا راز فاش کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ انھیں دھوکے میں آکر اچھا اور بلند پایہ فنکار سمجھ لینا ایسی خطرناک غلطی ہے جس کا ازالہ ناممکن ہے۔

گزشتہ پچیس تیس برس میں زندگی کے بدلتے ہوئے میلانات اور رجحانات کے ساتھ ہمارے اُردو ادب کی رفتار بھی (جو عام طریقہ سے بہت سست رہی ہے) تیز رہی ہے، مگر ۱۹۳۵ء کے بعد سے اس کی رفتار بہت تیز و سریع ہو گئی ہے۔ سر سید۔ حالی۔ آزاد اور شبلی وغیرہ نے سب سے پہلے ہمارے ادب میں زندگی کا احساس پیدا کیا اور اس سے کام لینا سکھایا۔ اُن کے اس ادبی، علمی اور سماجی خدمت کو اقبال، چکبست اور پریم چند نے بڑے شد و مد کے ساتھ چمکایا۔ شاعروں میں اقبال اور نثر نگاروں میں پریم چند پہلی دو شخصیتیں ہیں جنھوں نے ادب اور زندگی کے ایک ناگزیر اور استوار ربط و تعلق کو محسوس کر کے اُردو ادب کو نئے اور اہم سیاسی، اقتصادی اور سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور ترقی پسندی کا سبق سکھلایا۔ پہلے اردو ادب پر سراسر جمود و تعطل چھایا ہوا تھا لیکن ان دو شخصیتوں کے اثر سے اس میں حرکت، عمل اور بیداری کی لہر محسوس ہونے لگی۔ اُردو شاعروں میں سب پہلے اقبال کو اس بات کا حکیمانہ احساس ہوا کہ زندگی ایک نامیاتی اور جدلیاتی حقیقت (Dialectic reality) ہے جو "امروز و فردا" کے پیمانے سے نہیں ناپی جا سکتی۔ انھوں نے نہایت بیباک طریقہ سے زندگی کے طور اور زمانہ کے تیور دیکھ کر مزدور کو اُس کے دور کے آغاز کا پیغام سنایا اور سرمایہ داری کی پُر فریب طلسم بندیوں سے اُسے آگاہ کیا۔ اُن کی شاعری کہیں کہیں جارحانہ عنصر رکھنے کے باوجود انسانیت پرست، تندرست اور نہایت جاندار چیز ہے اور زندگی کی نئی انسانی قدروں کی شدت کے ساتھ حامل۔ اُردو شاعری میں ہم آج جو حرکت و عمل دیکھ رہے ہیں اس کی اولیت کا سہرا اقبال ہی کے سر ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو انسانیت، آزادی، قوت حیات اور تعمیری فکر کے عنصر سے روشناس کرایا اور بتایا کہ شاعری سے بھی ایک نصب العین تک پہونچنے کا کام لیا جا سکتا ہے اور لینا چاہئے لیکن ترقی پسند شاعروں کو اقبال سے یہ سیکھنا چاہئے کہ ایک بلند مقصد رکھنے والی شاعری بھی حیرت انگیز حد تک فن لطیف ہو سکتی ہے ہاں اس کے لئے "خونِ جگر" کی رنگینی اور فکری صناعی درکار ہے جو بڑی محنتوں اور ریاضتوں کا ثمرہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں سے کئی ایک نے بڑے ریاض اور مشق کے بعد اسے حاصل کیا ہے ترقی پسند شاعری دہشت پسندی، سطحیت، فن سے بے پروائی کلبیت اور کہیں کہیں تعصب اور تنگ نظری کا بھی بُری طرح شکار ہوئی ہے مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اپنی ان خامیوں اور پستیوں سے قطع نظر یہ ایک رُخ ایک نصب العین، قوت حیات، بالیدگی، تعمیری قوتِ فکر اور ایک اچھا نیا اور بلند فنکارانہ احساس بھی رکھتی ہے۔ ترقی پسند شاعروں میں کئی ایک حیرت انگیز فنی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ جوش، فراق، مجاز، فیض، جذبی، علی سردار جعفری، جواد زیدی اور مخدوم محی الدین وغیرہ کی شاعری کہیں کہیں فن، زبان اور خیال کی خامیوں کے باوجود جمالیاتی محاسن سے بھری پڑی ہے اور اس کی قوت حیات، عظمت، بالیدگی، توانائی، انسانیت پرستی، تخلیق اور تعمیری قوت فکر تو بہر حال اُردو شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔ ترقی پسند شاعری کے خلاف جذباتی مخالفت کا ایک طوفان اُٹھا مگر مخالفوں کے اعتراضات زیادہ تر نظم معریٰ (Blank Verse) اور نظم آزاد (Free Verse) کے متعلق ہیں۔ اگر تھوڑی دیر

کے لئے تعصب کی عینک اُتار کر دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کا وجود چند سر پھروں کی بے معنی جدت نہیں بلکہ یہ فطری طور پر پیدا ہوئی ہے اور اُس انسانی آزادی کی پیدا کردہ ہے جس نے فکر و خیال کے ساتھ ناگزیر طور پر اظہار و بیان کے راستے بھی بدل دئے ہیں۔ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کا زیادہ حصّہ اگرچہ سطحی، مبہم، بے معنی اور یونہی سی جدت کے مترادف ہے لیکن ذرا گہرائی میں اُتر کر پرکھا جائے تو فیض، راشد، اختر الایمان، مخدوم، علی سردار زیدی اور وامق احمد مجتبےٰ کے یہاں اسکے بعض قابلِ قدر نمونے مل جائیں گے اس لئے ہمیں اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صنفِ سخن تحلیل نفسی اور لاشعور کی گہرائیوں کے تجزیہ کے لئے بڑی کار آمد ہے اس کے علاوہ پابند نظموں سے علحدہ یہ اپنا ذاتی اور انفرادی حُسن، کیف اور اثر رکھتی ہے جو صرف اسی کے ذریعہ ممکن ہے۔ لیکن ایک بات نہ بھولنی چاہئے اور وہ یہ کہ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کی وادی بڑی دشوار گزار وادی ہے، ہر شخص کو اس میں آسانی سے نہ چل کھڑا ہونا چاہئے اس میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے فن کے ایک پختہ اور رچے ہوئے شعور اور کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی حیرت انگیز صلاحیت درکار ہے۔ اس میں ایک لفظ کی زیادتی اور کمی پوری نظم کے فنکارانہ حُسن کو تباہ کر ڈالتی ہے۔ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کے میدان میں کامیاب ہونے کے لئے ابھی ہمارے شاعروں کو بہت غور و فکر، فنی ریاضت اور چابکدستی سے کام لینا پڑے گا اور اگر ایسا ہوا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ترقی پسند شاعر نظم معرّیٰ اور نظم آزاد کے کامیاب، بلند پایہ اور اعلیٰ نمونے نہ پیش کر سکیں لیکن ہمارے نئے ادب میں سب سے زیادہ ترقی افسانہ نگاری اور تنقید نے کی ہے اور مجموعی حیثیت سے سارے ادب پر یہی دو اصنافِ ادب خاص طور سے جاری ہیں۔

اُردو نثر نگاروں میں پریم چند سب سے پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ رومان اور تخیل کی محبوس چار دیواری سے نکل کر زندگی کی واقعیت اور ٹھوس حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی اور ہم پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ایک مردہ رومانیت اور تصور پرستی کے قلعہ کو ڈھا کر انھوں نے ہماری نثر کی دنیا میں قیمتمند زندگی سے بھرپور اور ترقی پسند عناصر پیدا کئے جن کے بل بوتہ پر ہمارے نئے اور ترقی پسند افسانہ نگار آج اپنی بلند تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے ذہنی عیاشی اور خواب آور کیفیتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہندوستان کے عوام اور خاص طور سے دیہاتی عوام کی زندگی کے مرقعے پیش کئے۔ اُن پر آئے دن جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور جو قیامتیں توڑی جاتی ہیں اُن کا نقشہ پیش کیا اور ہمیں اُس انسانیت سے قریب کر دیا جو مفروضہ سماجی اور اخلاقی اقدار اور ظالم اور طبقاتی نظام کے نیچے دبی ہوئی کراہ رہی ہے۔ اس طرح اُردو ادب کو زندگی سے قریب لا کر انھوں نے ایک اصلاحی پہلو کو اُجاگر کیا لیکن آخر آخر میں وہ "کفن" جیسا ترقی پسند اور غیر فانی افسانہ لکھ کر مکمل طور پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی برادری میں شامل ہو گئے۔ اُن کی پُرانی روایت کو علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے کچھ دنوں تازہ رکھا لیکن

جلد ہی سجاد ظہیر، رشید جہاں اور احمد علی وغیرہ کے اُن ذہنی بغاوت کے شعلوں نے جو "انگارے" میں بہت اعتدالی کے ساتھ بند کئے گئے تھے تیزی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا اور منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر رائے پوری اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، حسن عسکری اور ممتاز مفتی وغیرہ کے چراغ روشن کرنے میں مدد دی - بعد میں علی عباس حسینی بھی اسی گروہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مستقل اور مکمل طور پر شامل ہو گئے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور علی عباس حسینی نے اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ان لوگوں میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی اور اب تو ان کی حیثیت اُن کی زندگی ہی میں کلاسیکل ہوتی جا رہی ہے - بیدی کے ہاں آرٹ اور فن کے ایک نازک اور متوازن احساس اور دکھی ہوئی زندگی کے تخیل آمیز مشاہدہ کا جو واقعیت اور سچائی سے لبریز ہے ایسا متوازن اور حسین امتزاج ملتا ہے جو اُسے دوسری زبان کے بلند پایہ افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں ایک اچھی اور بلند حیثیت سے پیش کرتا ہے - اسکے علاوہ اسکے افسانوں کی مٹھاس، معصومیت اور نفسیاتی ژرف بینی بھی حیرت انگیز چیزیں ہیں - کرشن چندر گو فن کی پابندیوں کا زیادہ خیال نہیں کرتا اور کبھی کبھی جذباتیت اور خطابت کا سہارا بھی لے لیتا ہے، لیکن اس کے افسانوں میں میدانوں کی سی وسعت، ہواؤں کی سی تازگی اور دریاؤں کی سی روانی اور آزادی ملتی ہے جو اس کے افسانوں کو اتنا رنگین، وسیع، گہرا اور سرسبز و شاداب رکھتی ہیں کہ اُردو ادب میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا - کرشن چندر نے زندگی کے وسیع سمندر میں ڈوب کر اور اُبھر کر غریبوں اور معصوموں پر سماج کی چیرہ دستیوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کے اسباب و علل کا راز دریافت کیا ہے اور انھیں ایسے حسین اور خوش نما انداز اور اسلوب میں بیان کیا ہے کہ نگاہوں کے سامنے ایک تعمیری پہلو بھی آجاتا ہے جس کی چنگاریاں تخریب کے خاکستر میں نہاں ہیں - کرشن چندر کی زندہ اور شاداب رومانیت، فلسفیانہ اندازِ فکر اور طنزیہ اندازِ بیان میں بھی بڑی کیفیت اور گہرائی ہے اور ان لوگوں کے بعد حسینی، اختر رائے پوری، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی اور منٹو وغیرہ کے یہاں فنی خامیوں اور فکری کمزوریوں کے باوجود ایسے بلند پایہ افسانے ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر ہم زندگی کی نئی بے چینیوں، کیفیتوں اور پیچیدگیوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور ایک نئے انسانیت پسند سماج اور نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں - یہ افسانے صرف سیاست اور اشتراکیت کا ضمیمہ نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنی جمالیاتی خوبیوں اور فنی محاسن کی وجہ سے "ادب عالیہ" میں شمار ہو سکتے ہیں - عصمت، منٹو، عسکری اور ممتاز مفتی اپنے نفسیاتی اور بالخصوص جنسی نفسیات کے مردِ میدان ہیں اور زیادہ تر جنسی الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں - اب یہ لوگ "پھسلن"، "بو"، "دھواں" اور "خلط ملط" کے قسم کے افسانوں کی سطح سے بلند ہو چکے ہیں اور بعض دفعہ ایک اچھا، کامیاب اور صحتمند نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جو ہر حال میں ترقی پسند ہے - شروع شروع میں جنسیات کی بڑی گرم بازاری رہی اور نام نہاد ترقی پسندی کی آڑ میں فحاشی، جنس پرستی اور ذہنی عیاشی بری طرح ادب میں

داخل ہوتی رہی مگر جلد ہی ادیبوں اور نقادوں نے اس کے کھوکھلے پن، سطحیت اور نقصان دہ عناصر کو محسوس کر لیا اور اس کے خلاف جلد ہی ردعمل شروع ہو گیا۔ اس سیلاب کو روکنے میں پروفیسر احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر اور آلِ احمد سرور وغیرہ نے ایک خاص خدمت انجام دی۔ اب بھی اگرچہ جنسی میدان میں زیادہ تر افسانے کمزور اور غیر صحتمند قسم کے ملتے ہیں لیکن پہلے کے مقابلہ اس کا معیار کافی بلند ہے اور اب ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جو اس میدان میں صحت مندی، اصلاح اور ایک بلند مقصد پر خاص طور سے توجہ رکھتے ہیں۔ اُردو افسانہ کی اس ترقی کو دیکھتے ہوئے جب ہم ترقی پسند ادب میں ناول اور ڈراموں پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ پریم چند کی "گئودان" اور "میدانِ عمل" سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" قاضی عبد الغفار کی "لیلےٰ کے خطوط" (اور ادب میں ناولوں کو دیکھتے ہوئے اسے بھی ناول کہیئے) کرشن چندر کی "شکست" عصمت کی "	" اور عزیز احمد کی "گریز" ناولوں میں اور ڈاکٹر عابد حسین کا "پردۂ غفلت" سجاد ظہیر کا "بیمار" علی سردار کا یہ "کس کا خون ہے" اور منٹو اور اشک کے مختصر اور ایک ایکٹ کے ڈرامے ڈراموں میں ذرا معیاری چیزیں ہیں لیکن صرف اتنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی نئی زندگی اور نئے دور میں ترقی پسند ناولوں اور ڈراموں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو چاہئے کہ وہ کثرت کے ساتھ محنت اور مشقت سے کام لے کر بلند پایہ اور صحیح معنوں میں ترقی پسند ناول اور ڈرامے لکھیں۔ طنز نگاری کا میدان بھی بالکل خالی پڑا ہے اور صرف ایک ہی آدمی ہے جو اس کا مرد میدان ہے۔ کنہیا لال کپور اپنی دنیا میں بالکل اکیلے ہیں، لیکن انھوں نے ایسی معیاری، بلند پایہ، صحت مند اور جاندار چیزیں تخلیق کی ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے ہم سے یہ احساس چھین لیتی ہیں کہ وہ اس میدان میں تنہا ہیں۔ ان کے وہاں ترقی پسندی کا ایسا بلند اور صحت مند تصور اور فنی پختگی کا ایسا رچا ہوا شعور ملتا ہے جس نے ترقی پسند ادب کی عظمت کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے طنز نگاری کو اُردو ادب میں ایک نئی زندگی بخشی ہے۔

اُردو ادب کی ان ترقیوں کے ساتھ فطری اور لازمی طور پر اُردو میں ادبی تنقید نے بھی ترقی کی ہے قدیم اُردو تنقید کی ارتقائی اور ترقی یافتہ شکل ہمیں ڈاکٹر بجنوری، نیاز فتحپوری، عبد الحق، مسعود حسن رضوی، برجموہن کیفی دتاتریہ وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ تنقید کی اس ارتقائی صورت کے ساتھ ادبی مارکسیت کے گہرے اور دور رس اثرات نے ملکر ایک نئی تنقید کو جنم دیا جسے ہم مارکسی یا ترقی پسند تنقید کہہ سکتے ہیں۔ ترقی پسند نقادوں میں پروفیسر احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، فراق، فیض، وقار عظیم، آل احمد سرور، عزیز احمد، سجاد ظہیر، اختر رائے پوری، عبادت بریلوی اور خلیل الرحمٰن وغیرہ کی تنقیدیں خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان لوگوں نے موجودہ دور میں ادبیات کو پرکھنے کے لئے نئے اصول وضع کئے ہیں، نئے پیمانے تراشے ہیں اور نئے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ یہ لوگ ادب کو معاشی اور اقتصادی توجیہ اور نئے سائنسی اور علمی امکانات کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ چاہے وہ پرانا ادب کیوں نہ ہو کیونکہ ان کے نزدیک کوئی ادب

"روحِ عصر" سے بے نیاز ہو کر وجود میں نہیں آسکتا۔ ترقی پسند نقاد ادب میں فنی محاسن، وجد و سرور، اور مستی و بیخودی کے علاوہ انسانی اور سماجی زندگی کے اُن محرکات اور اُن خواہشات کا پتہ لگانا چاہتا ہے جو زندگی میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور اُسے ایک نئے انسانی مستقبل کی طرف بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ترقی پسند نقاد اپنے ادیبوں اور شاعروں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اور تاریخی اور ارتقائی قوتوں کا ساتھ دیتے ہوئے تمام انسانوں کو فنی، ادبی اور شاعرانہ انداز میں ایک نئے اور انسانی قدروں سے معمور نظامِ زندگی پیدا کرنے کے لئے دعوتِ غور و فکر اور دعوتِ انقلاب دیں۔ زمانہ اب ادب میں خیال و بیان اور موضوع و اسلوب کا وہی ربط دیکھنا چاہتا ہے جو جسم اور جان میں ہے۔ اس کے نزدیک ایک بلند خیال اور اچھے مقصد میں آخر اور کیف بیان کے حسین، انوکھے اور خوبصورت طریقوں سے پیدا ہوتا ہے اور ایک حسین اور انوکھے طرزِ اظہار میں جان ایک اچھے خیال اور بلند مقصد سے آتی ہے۔

ترقی پسند تنقید نے کہیں کہیں باوجود تکرار، انتہا پسندی جذباتیت اور دوسری خامیوں کے اردو ادب میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے اور اس کا معیار بلند اور وقیع کرنے میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے اور ترقی پسند نقادوں میں احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری اس لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ زیادہ تر انھیں دو حضرات کی کوششوں کو ترقی پسند ادب کا ایک سچا، صحیح، متوازن اور بلند معیار پیش کرنے میں دخل رہا ہے۔ ان کی تنقیدیں بڑی متوازن پختہ اور گہری رہی ہیں۔ انھوں نے قدیم ادب سے محبت اور اس کی مدد سے نئے نئے تجربات حاصل کرنا سکھایا ہے جو ہر لحاظ سے ایک مستحسن اقدام ہے۔ قدیم ادب سے واقفیت اور اس کے کار آزمودہ اسالیب کا شعور ترقی پسند شاعروں کو ایک خاص بلندی عظمت اور پختگی عطا کر سکتا ہے اور اُن کی شاعری کو اور زیادہ وقیع بنا سکتا ہے اس چیز کا احساس پیدا کرنے میں سب سے زیادہ انھیں دو حضرات کا ہاتھ رہا ہے۔

یہ تھی ترقی پسند ادب کی ایک ہلکی سی جھلک۔ اسے دیکھ کر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اس میں بے اعتدالیوں، فنی خامیوں اور کمزوریوں سے قطع نظر بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ اس میں آزادی ہے، حرکت ہے، قوتِ حیات ہے، زندگی کا حوصلہ ہے، تعمیری قوتِ فکر ہے اور ایک نیا اور اچھا فنی احساس اور پختہ ادبی شعور ہے۔ اس میں صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیائے انسانیت کا دل دھڑک رہا ہے اور اگر ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے غور و فکر اور ریاضت سے کام لے کر اور اپنی خامیوں بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کو دور کر کے انہماک اور خلوص کے ساتھ تعمیری خدمت انجام دی تو وہ زیادہ دور نہیں جب دنیا کے ادبی نقشہ پر اُردو ادب کو ایک نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل ہوگی۔

سید محمد مثنیٰ رضوی

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز کے اہم تمام مقالات کا مجموعہ جن میں عصرِ حاضر کے اکابر شعراء کے کلام پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔

باب المراسلہ والمناظرہ

مسئلۂ اعداد

سالِ گزشتہ نگار (ستمبر، اکتوبر، نومبر) میں ح - ا کا ایک مسلسل مضمون "ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس میں انھوں نے ہندو اعداد کی موجودہ شکلوں کا سامی ذرایع سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا۔ لیکن ہم نے مضمون پڑھ کر اس سے مختلف نتایج اخذ کئے ہیں، جنھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ح - ا کے نظریہ کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ عربی دور کے حصۂ اول میں (۶۹۸ء سے ۸۰۵ء تک) اہلِ عرب کو اہلِ ہند کے اعداد کا علم حاصل ہوا اور انھوں نے اسی طریقہ کو پسند کیا جس کے مطابق ایک سے نوتک کے اعداد متفرق طور پر علحدہ علحدہ ہندوستان میں قایم اور رایج تھے اور پھر اپنے طور پر وہ اعداد قایم کئے جن کو غباری ہندسے کہا جاتا ہے انھیں ہندسوں کی ترویج عربی کے دور سویم میں (۸۰۰ء سے گیارھویں بارھویں صدی تک) ہند میں ہوئی جہاں اُلٹی جانب سے لکھے جانے کے باعث اُن کی شکلیں منقلب ہوگئیں اور اس کی ایک بیّن دلیل یہ ہے کہ دوسرے دور کے اخیر تک یعنی ۸۰۰ء تک ہندوستان میں جدید شکل کے ہندسے موجود نہ تھے۔

مزید تصدیق کے لئے غباری اور قدیم ناگری ہندسوں کی تقابلی اشکال دی گئی تھیں جنھیں جدید ناگری ہندسوں کے اضافہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

غباری ہندسے	زمانہ قبل از ۷۵۰ء	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
قدیم ناگری ہندسے	زمانہ ۵۰۰ء تا ۱۱۰۰ء	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
جدید ناگری ہندسے		१	२	३	४	५	६	७	८	९

بالائی جدول میں جب آپ پانچ اور چھ کے مروجہ ناگری ہندسوں کا مقابلہ ان کے قدیم مماثل سے کریں گے تو آپ کو غور آ

اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ جن قدیم ناگری ہندسوں کو پانچ کی تحت لکھا گیا ہے انھیں چھ کی تحت لے جانا چاہئے اور چھ کی تحت جس ہندسے کو لکھا ہے اُسے پانچ کی تحت لانا چاہئے۔ ایسا کرنے پر آپ دیکھیں گے کہ قدیم ناگری ہندسوں میں بڑی حد تک تطابق پیدا ہو جاتا ہے لیکن غباری ہندسوں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، یہی نہیں بلکہ قدیم ناگری چھا (چھ) اور اسی کے ہم آواز ناگری حرف چھ (چھ) میں بڑی مشابہت ہے اور قیاس غالب یہی ہے کہ اول الذکر آخر الذکر سے ماخوذ ہے اور اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ یونانیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے جو کسی وقت پانچ کا اظہار پائی (П) سے کرتے تھے جو Penta کا پہلا حرف اور دس کا ڈیلٹا (Δ) سے جو Deka کا پہلا حرف ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اس طرح معلوم ہوا کہ اگر ہندوؤں نے گنتیوں کے نام کی پہلی آواز والے حروف سے کام لیا ہو تو یہ ناممکن نہیں ہے۔ اس لئے آیئے اس اُصول کو ہم دیگر اعداد پر آزمائیں۔

پہلے ہم پانچ کو لیں گے۔ اس کی پہلی آواز "پا" حرف ناگری میں پا (प) ہے۔ چھا کی طرح اس کا بھی بالائی خط اُڑا دیجئے، کیونکہ پہلے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس امر کی تائید میں ہم ناگری کے ایک دوسرے حرف ا (अ) کی ارتقائی اشکال پیش کرتے ہیں:

تیسری شکل میں (بائیں سے دائیں کو) آپ یہ خاص بات پائیں گے کہ عمودی لکیر کے سرے پر اس ۸ قسم کے ایک خط کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (شاید خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے) اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ پا (प) کو خوبصورت بنانے کے لئے اس قسم کی کوشش کی گئی ہو۔ مذکورہ خط کے اضافہ سے پا یہ (प) شکل اختیار کر کے ناگری کا پانچ بن جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ مذکورۂ بالا مثالوں سے معلوم ہوگا کہ ہمارا اُصول بالکل صحیح ہے پھر کیوں نہ اسے بقیہ اعداد پر آزما دیکھا جائے آیئے سب سے پہلے ایک سے شروع کریں۔ اس کی پہلی آواز والا حرف ناگری میں اے (ए) ہے جس کی ارتقائی اشکال حسب ذیل ہیں:

ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اے (ए) کا بالائی خط بعد کا اضافہ نہیں ہے اس لئے اس کے اُڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پانچ اور چھ کی طرح یہاں بھی ہم سب سے آخری شکل (بائیں سے دائیں کو) لیں گے کیونکہ ح۔ ا کا یہ قول کہ آٹھویں صدی تک ناگری کے جدید ہندسوں کا کوئی وجود نہ تھا، بہت کچھ حقیقت پر مبنی ہے، ظاہر ہے کہ اس (ए) شکل نے قلم کو بلا اُٹھائے لکھنے کی کوشش میں یہ ० شکل اختیار کر لی ہوگی مگر اسے ایک کی علامت کے طور پر استعمال نہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ نو ९ سے مشابہ ہے اس لئے اُس کا رُخ پھیر دیا گیا ایسا کرنے سے یہ ٩ شکل حاصل ہوتی ہے اس کا مقابلہ ناگری کے ایک (१) سے کریں گے۔ دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ شکل اول میں شکل آخر کی طرح گھماؤ نہیں ہے مگر ہم اس کے تدریجاً پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں کیونکہ عربی حروف کی مثال ہمارے سامنے ہے جن کے خفیف سے طویل گھماؤ سے بدل گئے تھے۔

چند مثالوں[1] سے ہمارا مطلب شاید اچھی طرح واضح ہو سکے

ص	ح	س
م	ح	س

اکثر حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ ناگری اعداد براہمی اعداد کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ ہم اُن کے اس قول کو ایک تا چار ناگری اعداد پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ نقشۂ مشمولہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ براہمی میں ایک سے تین تک اعداد کا اظہار آڑی لکیروں سے کیا جاتا تھا اور چار کے لئے صلیب بنائی جاتی تھی۔ ان نشانات اور خروشتی نشانات میں جو شمالی پنجاب اور مشرقی افغانستان میں رائج تھی صرف اتنا ہی فرق ہے کہ براہمی میں آڑے خط کھینچے جاتے تھے اور خروشتی میں کھڑے۔ اسی طرح جب کہ براہمی میں صلیب کا نشان کھڑا تھا تو خروشتی میں جھکا ہوا۔ اس تشابہ کی بنا پر نومبر ۴۸ء کے مضمون میں ح۔ ا نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ براہمی کے ان اعداد کا ماخذ خروشتی ہے۔ اس سے ہم متفق نہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ قدیم میں اعداد کا کام سیدھی لکیروں سے اسی طرح لیا جاتا تھا جیسا کہ آج بھی ناخواندہ عورتیں کوئلہ سے لکیریں کھینچ کر اور تنبولی چونے کے نشانات سے لیتے ہیں۔ چنانچہ مصر اور بابل میں ایک دو نہیں بلکہ نو تک اعداد کا اظہار سیدھی لکیروں سے کیا جاتا تھا اور چین میں آج تک ایک دو اور تین کے لئے ـــ = ≡ اشکال پائی جاتی ہیں پھر ایسی حالت میں ایک سے تین تک کے ہندسوں کے لئے براہمی کو خروشتی کا زیر بار احسان بتانا کیا معنی رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی کچھ ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ برہمنوں نے اعداد کے لئے اُن لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہو جن کی زبان کو کھراوشٹی (یعنی گدھے کے ہونٹ والی) کہکر مذاق اُڑایا ہو۔

خروشتی	براہمی	ہندو	ناگری
I	—	.	१
II	=	[illegible]	२
III	≡	[illegible]	३
X	+	.	४

جدول بالا میں چار کی تحت جو خروشتی نشان دیا گیا ہے وہ ح۔ ا کے نومبر کے مضمون سے لیا گیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ نشان کس کتبے میں پایا جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ان (IIII او IXI او III، او I) پانچ اعداد کے سوا خروشتی کے بقیہ اعداد کا کوئی علم ہی نہیں ہے اس لئے اس نشان کے متعلق فی الوقت کوئی بحث نہیں کروں گا۔

اب رہی دو۔ تین اور چار کی ارتقائی صورت سو ان کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ کتبات کی لکھائی اور کاغذ یا بھوج پتر کی لکھائی میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔ الواحِ سنگ پر ایک ایک حرف بڑے تکلف کے ساتھ کندہ کیا جاتا ہے اور کاغذ پر قلم کو بلا اُٹھائے مسلسل تحریر لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ مصری ہیراغلفی کی اس[2] شکل نے

---

[1] دیکھئے نقشہ نمبر ۱ صفحہ ۶، نگار بابت جولائی ۴۸ء مضمون "آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا"۔ [2] خروشتی اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ہر اطیقی میں یہ ح شکل اختیار کرلی تھی - اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ = لکیریں زود نویسی میں ⌐ اور ≡ لکیریں ⌐ شکل اختیار کرلیں - یہی حال عدد چار کا ہے جسے یوں + لکھا جاتا تھا - غالباً بعد میں اس نے یہ × شکل اختیار کرلی اور پھر زود نویسی سے یہ ﻻ اور اس طرح ناگری کا چار (ﻻ) حاصل ہوا -

اس طرح ہماری بحث کا ماحصل یہ ہوا کہ ناگری کے اعداد ایک، پانچ اور چھ ان اعداد کی پہلی آواز والے حروف سے بنے ہیں - دو اور تین اتنی ہی آڑی لکیروں سے - چار ایک صلیب کے نشان سے اور خود صلیب چار لکیروں سے (+ = ⊢ ⊢ — ||||) ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ بقیہ اعداد کے وضع کرنے میں اہلِ ہنود نے انھیں طریقوں پر اکتفا کیا ہو - جس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ مذکورۂ بالا دو قوانین سات سے دس تک کے اعداد کے ارتقا کی تشریح کرنے میں بالکل ہی ناکام رہتے ہیں - یہ اعداد کیونکر وضع کئے گئے - اس کے متعلق فی الحال میں کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتا - بہرحال اتنا تو ثابت ہی ہے کہ ناگری ہندسے خود ہندوؤں کی ایجاد ہیں نہ کہ غباری ہندسوں سے ماخوذ - مضمون ختم کرنے سے پیشتر معلوم ہوتا ہے کہ ان غباری ہندسوں کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان سے ح - انے یہ نتیجہ کیونکر اخذ کرلیا کہ وہ ناگری کے جدید ہندسوں کا ماخذ ہیں -

(۱) 1-2-ڇ-ے-٢-6-7-8-9

(۲) ١-٢-٣-٤-٩-٦-٧-٨-9

(۳) 1-2-3-ع-3-6-ى-8-9

ان کے متعلق لکھتے ہیں: "ظاہر ہے کہ ۲،۱ کی شکلیں موجودہ عربی ہندسوں کی شکلیں ہیں اور سیدھی جانب ہی سے لکھے جانے کے قابل ہیں - نمبر ا و ۳ کی شکلیں زیادہ تر یورپی ہندسوں کی شکلیں ہیں اور دونوں جانب سے لکھے جانے کے قابل ہیں - کم و بیش اسی نمط پر تمام ناگری اعداد ہیں -" ہم یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ یہاں پر موصوف کے کہنے اور کرنے میں فرق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بتاتے تو ہیں ناگری اعداد کو ایک اور تین کے نمط پر اور مقابلہ کرتے ہیں ۲،۱ کی شکلوں کا قدیم ناگری ہندسوں سے - (ملاحظہ ہو جدول ۱)

موصوف کے مضمون سے ایک اور اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ عربوں نے ان ہندسوں کو کیونکر وضع کیا :- "ملک شام میں پہلے ہی سے ایک اور دو کے ہندسوں کی شکل (۱-۲) تھی - جن کو ملا کر اہلِ شام نو تک اعداد بنایا کرتے تھے چنانچہ غباری ہندسوں کے پہلے دو اعداد ایک اور دو کی وہی قدیم شکل قائم رہی - باقی سات ہندسے

۱	ا
۲	٢
۳	٢١
۴	٢٢
۵	ح
۶	حا
۷	[illegible]
۸	ح٢١
۹	ح٢٢
۱۰	7
۱۱	7
۱۹	٢٢ح7
۲۰	٥
۲۱	10
۳۰	75
۴۰	00
۵۰	700
۶۰	000
۷۰	7000
۸۰	0000
۹۰	70000
۱۰۰	[illegible]
۲۰۰	[illegible]
۳۰۰	[illegible]

۱ دیکھئے نقشہ نمبر ۵ - صفحہ ۱۶ نگار بابت جولائی، مضمون "آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا"

عربی الفاظِ شمار سے ماخوذ کئے گئے" "مثلاً لفظ ثلثہ سے تین کا ہندسہ"۔

قبل اس کے کہ غباری ہندسوں کے اول دو اعداد کا ماخذ شامی کو ٹھیرا دیا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود شامی علامات شمار پر نظر ڈال لی جائے جنھیں برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے نہم اڈیشن سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ جدول مشمولہ کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بحالت مجموعی شامیوں کا طریقہ شمار اس عہد کو دیکھتے ہوئے اتنا ترقی یافتہ ہے کہ اگر عربوں نے شامیوں کی طرف رجوع کیا ہوتا تو انھوں نے ان کے نظام کو بعینہ اپنا لیا ہوتا۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک اور دو کے تو ہندسے لے لیتے مگر بقیہ کو چھوڑ دیتے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ غباری کے پہلے دو ہندسوں کا ماخذ شامی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

باقی بچے سات ہندسے جنھیں موصوف عربی الفاظِ شمار سے ماخوذ بتاتے ہیں تو ہمیں اسکے باور کرنے میں تامل ہے کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ لفظ شمار کے پہلے حرف سے عدد ماخوذ ہو جیسا کہ ناگری کے سلسلہ میں ثابت کیا جا چکا ہے مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خود ثلثہ "تین" بن جائے "اربعہ" "چار" اور "خمسہ" "پانچ"! پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہندسوں کا نام غباری ہندسے کیوں ہوا؟ علاوہ ازیں تینوں نمونوں کا تنوع زمان و مکان کے بُعد کا پتہ دیتا ہے یعنی یہ کہ یہ ہندسے ایک ہی قبیلہ کے لوگوں میں نہ رائج رہے ہوں گے بلکہ دور دراز تک پھیلے ہوں گے اور ان میں ایسی تبدیلیاں کہ ۸ شکل ۵ سے بدل جائے کافی عرصہ کے بعد ہوئی ہونگی پھر ان سب سے اہم یہ سوال کہ کیا عربوں کا یہ بیان کہ انھوں نے ۹ تک کے ہندسے ہندوؤں سے سیکھے اور اس لئے ان کا نام ارقام ہندسے رکھا[1] غلط ہے۔

ہندو ہندسوں کی عرب میں ترویج کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے "عرب و ہند کے تعلقات" میں صفحہ ۱۳۴ پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ٹھیک وہ زمانہ نہیں معلوم جس میں عربوں نے یہ طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ مگر خیال یہی ہے کہ ۱۵۶ سنہ (۷۷۳ء) میں سندھ سے جو پنڈت سدہانت لے کر منصور کے دربار میں بغداد آیا تھا اُسی نے عربوں کو یہ طریقہ سکھایا"۔ لیکن فاضل محقق کا بیان ہے، کہ غباری ہندسے دمشقی دور سے متعلق ہیں اور سدہانت کا ترجمہ بغدادی دور میں ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ کہ "جب سدہانت کے ترجمے کے ساتھ ہندوستانی ہندسے عرب پہونچے تو غباری ہندسوں سے لوگ واقف تھے"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حضرات کے متضاد بیانات سے کیا نتیجہ نکالیں۔ بہرحال میں امید کرتا ہوں کہ ح۔ا ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔

اسحاق محمد

[1] عرب و ہند کے تعلقات۔ صفحات ۱۳۳-۱۳۴

ہندو پاکستان کے ادبا کا ذہنی اتحاد

ہفتہ وار "نورنگ"

میں ملاحظہ کیجئے۔ جو یکم جولائی میں کراچی سے شائع ہو رہا ہے — آغا سرخوش قزلباش۔ دفتر "نورنگ"۔ کراچی ۳

مطبوعات موصولہ

صحیفۂ ٹیپو سلطان تصنیف ہے جناب محمود خاں محمود بنگلوری کی جو جنوبی ہند اور خصوصیت کے ساتھ سرزمین میسور کے بڑے مستند مورخ ہیں - کتاب کا موضوع ٹیپو سلطان کے کارناموں پر روشنی ڈالنا ہے اور اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے اس خدمت کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے -

ٹیپو سلطان کے نام سے یوں تو ہر شخص واقف ہے اور کم و بیش یہ علم بھی لوگوں کو ہے کہ وہ بڑا مجاہد تھا اور اس نے مغربی اثرات سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن اس کے کیرکٹر اور کارناموں کی صحیح روح سے مسلم جماعت بھی ناواقف ہے -

سترھویں صدی کا زمانہ مسلمانان ہند کے لئے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا - ہر جگہ ان کی حکومت کمزور ہوتی جارہی تھی اور انگریز اپنا اقتدار قایم کرتے جارہے تھے - یہی وہ زمانہ تھا جب سرزمین میسور سے سلطان ٹیپو نمودار ہوا اور اپنی سرفروشانہ جد و جہد سے اپنی ہستی پر مہر دوام ثبت کر گیا -

مغربی مورخین نے سلطان ٹیپو کا چہرہ بہت بدنما پیش کیا ہے اور ایک قزاق سے زیادہ حیثیت اسکو نہیں دی، لیکن جنھوں نے اس کی سیرت اور اس کے عہد کی تاریخ ہند کا غایر مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ٹیپو ہر حیثیت سے اتنا بڑا شخص تھا کہ اگر اورنگ زیب کے بعد سلاطین مغلیہ کو کوئی سردار ٹیپو ہی جیسا مل جاتا تو آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا -

ٹیپو اپنے بلند کیرکٹر، اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، اپنی فوجی قابلیت اور پختگی عزم و ارادہ کے لحاظ سے ایسا غیر معمولی شخص تھا کہ اگر انگریز مکر و فریب سے کام نہ لیتے تو کبھی اس کو زیر نہ کرسکتے، لیکن چونکہ حالات نامساعد تھے اور خود ہی لوگ ٹیپو کے دشمن ہوگئے جن کے لئے وہ لڑ رہا تھا اس لئے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا -

فاضل مصنف نے ان دو جلدوں میں سلطان ٹیپو کی سیرت کو خود اسی کے خطوط و فرامین سے مرتب کیا ہے جو تقریباً نایاب تھے اور جن کو بڑی محنت و کاوش سے مصنف نے حاصل کیا -

کتاب کی آخر میں بعض نہایت مفید ضمیمے بھی شامل کردئے گئے ہیں، جن سے نہ صرف ٹیپو سلطان بلکہ اس عہد کی

جنوبی ہند کی پوری تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر فاضل مصنف کو جتنی داد بھی دیجائے کم جاے۔ دونوں جلدوں کی قیمت آٹھ روپیہ ہے جو گوشۂ ادب لاہور سے مل سکتی ہے۔

اختر و اقبال مجموعہ ہے سیدہ اختر کی تضمینوں کا علامۂ اقبال مرحوم کی ۳۳ نظموں پر۔ تضمین بڑی مشکل صنعت سخن ہے اور اس میں وہی شاعر کامیاب ہو سکتا ہے جو بیانیہ شاعری میں مہارت تامہ رکھتا ہو پھر اگر تضمین کے لئے کوئی غزل انتخاب کی جائے تو یہ کام چنداں مشکل نہیں، لیکن نظموں کی تضمین اور نظمیں بھی اقبال کی! اس میں شک نہیں بڑی جرأت کی بات تھی، لیکن ہم کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ سیدہ اختر اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئیں اور بعض بعض نظموں کی تضمین بالکل الہامی معلوم ہوتی ہے مثلاً سب سے پہلی تضمین جو نظم مناجات پر کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

چمن کا دیوانہ حادثاتِ خزاں کے صدمات سہ رہا تھا
وہی دل از بس ملول تھا جو نشاط کا جلوہ گہ رہا تھا
عرق جبیں پر تھا اور آنکھوں سے اسکی خونناب بہہ رہا تھا
کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا

کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ خوش کلاہی، یہ خوش نگاہی مگر ہیں مکر و فریب سارے
کریں گے کیا رہبری کسی کی جو آپ ہیں گمرہی کے مارے
یہ ناخدا ہیں خدائے باطل، لگائیں گے ناؤ کیا کنارے
یہ زائرانِ حریمِ مغرب، ہزار رہبر بنیں ہمارے

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

جو راہبر خود ہوں مست و بیخود قدم نہ کیوں اپنا ڈگمگائے
جو رہنما آپ ہی غلط ہوں تو کون پائے طلب بڑھائے
میں پوچھتی ہوں کہ ان کو آخر کہاں تلک کوئی آزمائے
غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے

بگاڑ کر تیرے مسلموں کو بنائے ملت مٹا رہے ہیں

فضا ہی کچھ اور ہو گئی ہے، ہوا ہی کچھ اور چل گئی ہے
خراب تر ہے، مگر سمجھتے ہیں دل کی حالت سنبھل گئی ہے
زباں سے اقبال آپ کے کیوں یہ بات آخر نکل گئی ہے
سنے گا اقبال کون ان کو کہ انجمن ہی بدل گئی ہے

نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

کتاب طباعت و کتابت کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ ہے، سیدہ اختر اور علامہ اقبال کی تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ اس کی بابت خود محترمہ سیدہ اختر۔ سبزہ زار اختر بنگلور سے مراسلت کی جائے۔

زہریلے آنسو ترجمہ ہے قاضی نذر الاسلام کی بعض نظموں کا جسے جناب غلام سرور فگار نے اردو میں کیا ہے۔ اردو دنیا میں نذر الاسلام کو سب سے پہلے نگار ہی نے روشناس کرایا اور اسی کے ذریعہ سے اول اول معلوم ہوا کہ بنگال میں ایک مسلمان شاعر بھی ایسا ہے جس کا نام ٹیگور کے ساتھ ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ . . . .

اس کے بعد نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ بہت سے رسایل میں شایع ہوا اور رفتہ رفتہ اردو داں برادری کا ایک عزیز ہو گیا

نذرالاسلام کی شاعری انداز بیان کے لحاظ سے بالکل ٹیگور کی شاعری کی طرح ہے اور غالباً بنگال کی ادبی ذہنیت کا رجحان بھی یہ ہے کہ وہ تخیلی فضا پیدا کرکے ابہام و اشارات میں اظہار جذبات کرے، لیکن ٹیگور اور نذرالاسلام کی شاعری میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ ٹیگور کے یہاں مابعد الطبیعاتی رنگ زیادہ غالب ہے اور نذرالاسلام، ہمکو اسی دنیا سے دلچسپی لینا سکھاتا ہے اور اسی لئے ٹیگور کے یہاں حُسن بیان ہے اور نذرالاسلام کے یہاں جوشِ بیان۔

ترجمہ بہت شگفتہ ہے اور کتابت و طباعت بہت نفیس۔ قیمت دو روپیہ دس آنے۔ ملنے کا پتہ: نفیس اکاڈیمی حیدرآباد دکن

شعور و لاشعور ترجمہ ہے مشہور مصری عالم سلامہ موسیٰ کی مشہور کتاب "العقل الباطن" کا اس میں نفس انسانی اور خواب و بیداری میں اس کے میلانات کے نتائج پر بہت دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ سلامہ موسیٰ کی یہ کتاب نتیجہ ہے جرمن اور فرانسیسی لٹریچر کے مطالعہ کا، اس لئے جو معلومات اس میں درج ہیں وہ براہ راست ماہرین فن کے تجربات سے حاصل کی گئی ہیں ۔۔ کتاب مضامین کی ترتیب اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے اور فاضل مترجم نے اس دلچسپی کو اُردو ترجمہ میں بھی قایم رکھا ہے۔ اُردو میں نفسیات پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اس لئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً بڑی مفید خدمت ہے جو نفیس اکاڈیمی حیدرآباد نے انجام دی ہے۔ طباعت و کتابت وغیرہ نہایت پاکیزہ ہے۔ قیمت تین روپیہ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔

گاندھی نامہ مجموعہ ہے اکبر الہ آبادی مرحوم کے بعض اشعار کے مجموعہ کا جسے گاندھی نامہ کے نام سے صرف اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے بعض شعروں میں گاندھی جی کا ذکر صراحتاً یا اشارتاً آگیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار غیر مطبوعہ ہیں اور ایک ایسے مسودہ سے لئے گئے ہیں جس کا نام خود اکبر مرحوم نے گاندھی نامہ رکھا تھا۔ ابتدا میں پروفیسر رحیم الرحمان صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے، جس کو انھوں نے اس انداز سے لکھا ہے گویا وہ فلسفہ و حکمت کی کسی بڑی نایاب کتاب کو ایڈٹ کر رہے ہیں ۔۔ اکبر مرحوم اپنے رنگ کے منفرد شاعر تھے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ اُن کے خیالات سے بھی سب کو اتفاق ہو۔ اکبر مرحوم کا جتنا کلام شایع ہو چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی نقطۂ نظر بہت مبہم تھا اور انھوں نے کبھی کھُل کر کوئی بات نہیں کہی۔ اس لئے اس کتاب کو گاندھی نامہ کے عنوان سے شایع کرنا، گویا گاندھی جی کے متعلق اُن کے خیالات کی اشاعت کرنا ہے، حالانکہ انھوں نے گاندھی جی کے فلسفہ کو صحیح سمجھا بھی نہیں، اس پر عمل کرنا کیا معنی۔ شاعری کی حیثیت سے بھی اس کتاب کے اشعار کوئی خاص بات اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اکبر مرحوم کا جو کلام اس سے قبل شایع ہو چکا ہے، ان کی شہرت دوام کے لئے وہی کافی ہے اور ضرورت نہ تھی کہ گاندھی نامہ کی اشاعت کرکے اس میں اضافہ کی کوشش کی جاتی خاصکر ایسی صورت میں جبکہ شاعری اور خیالات دونوں حیثیتوں سے وہ بہت گری ہوئی چیز ہے۔

اس چار جزو کے رسالہ کی قیمت ساڑھے چار روپیہ بہت زیادہ ہے۔ کتابستان الہ آباد نے اسے شائع کیا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہاز راں کمپنی)

بحرِ احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیجدیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دیجا سکتی

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۱۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

ہفتہ وار اُجالا

ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار نویس مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی بانی و سابق اڈیٹر روزنامہ ہند، کلکتہ کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ "اُجالا" ہندوستان کے یوم آزادی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے شایع ہو رہا ہے گوناگوں دلچسپیوں، بہترین افسانوں، سیاسی، علمی اور تاریخی مقالوں، بلند پایہ نظموں، واقعات حاضرہ پر بے لاگ قوم پرستانہ تبصروں، اور خود ملیح آبادی صاحب کے خاص مضامین کے اس نادر مرقع کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ طلب کرنے پر نمونہ مفت بھیجا جائے گا۔ قیمت سالانہ چودہ روپے۔ ششماہی سات روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ پانچ آنے۔ مشتہرین اور ایجنٹ حضرات بھی شرائط طے کرنے کے لئے جلد خط و کتابت کریں۔

منیجر "اُجالا" ۲۲ لے۔ ساگر دت لین۔ کلکتہ ۱۲

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے۔ بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے رواج موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود آنے لگتی ہیں اسکو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر وزن آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی اس کے استعمال سے ۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی یہ دوا نئی نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگایئے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے میری ۲۹ سالہ شہرت پر غور فرمایئے۔

پتہ: حکیم ثابت علی پنج زبان، خوش کلام

(عالم مثنوی مولائے روم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

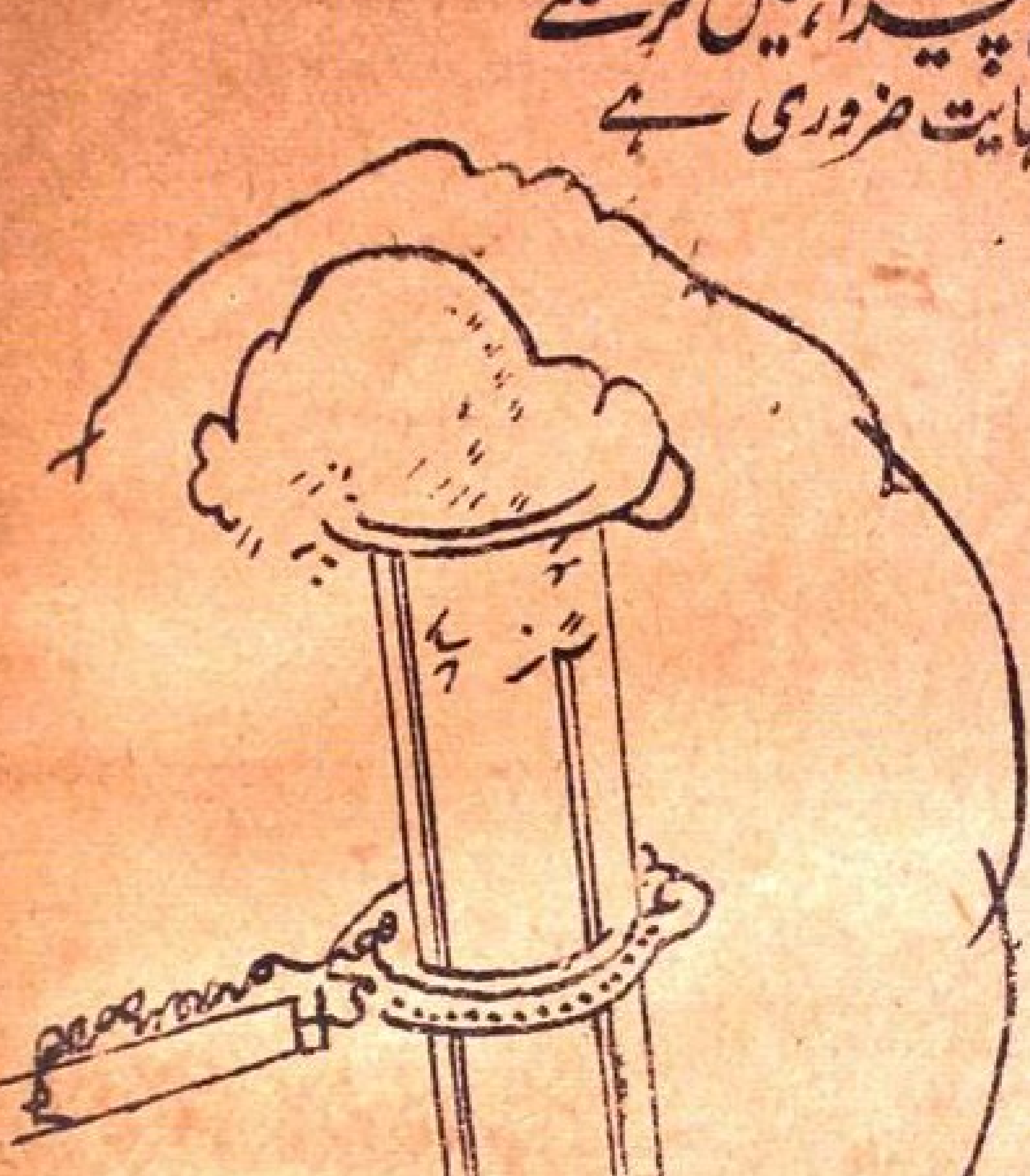

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کرسکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب وغریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے ، اُنکے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا۔ آخر کیوں ؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا!

صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے ، اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اصول کے پیش نظر طیار کی گئی ہے یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

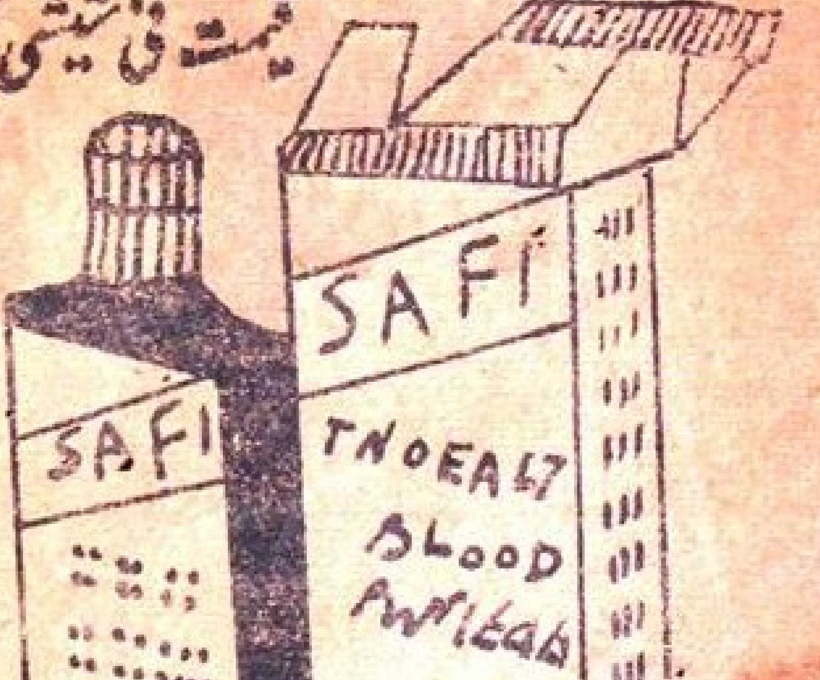

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"
ٹیلی فون: "ہوڑہ ۵۵۴"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ ....

فاسد مادہ کے بغیر

جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

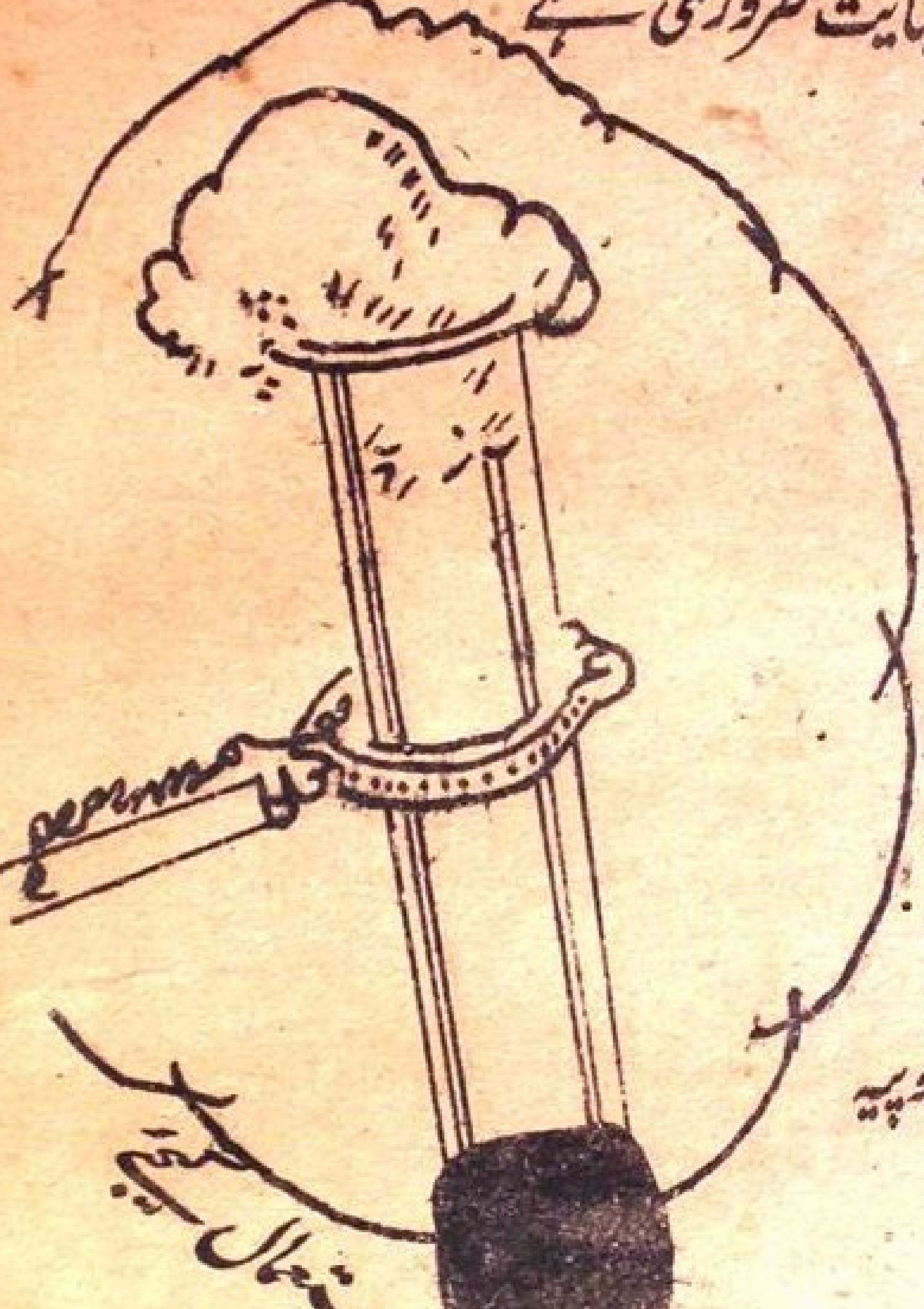

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فریر وفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے، اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اُصول کے پیشِ نظر طیار کی گئی ہے خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

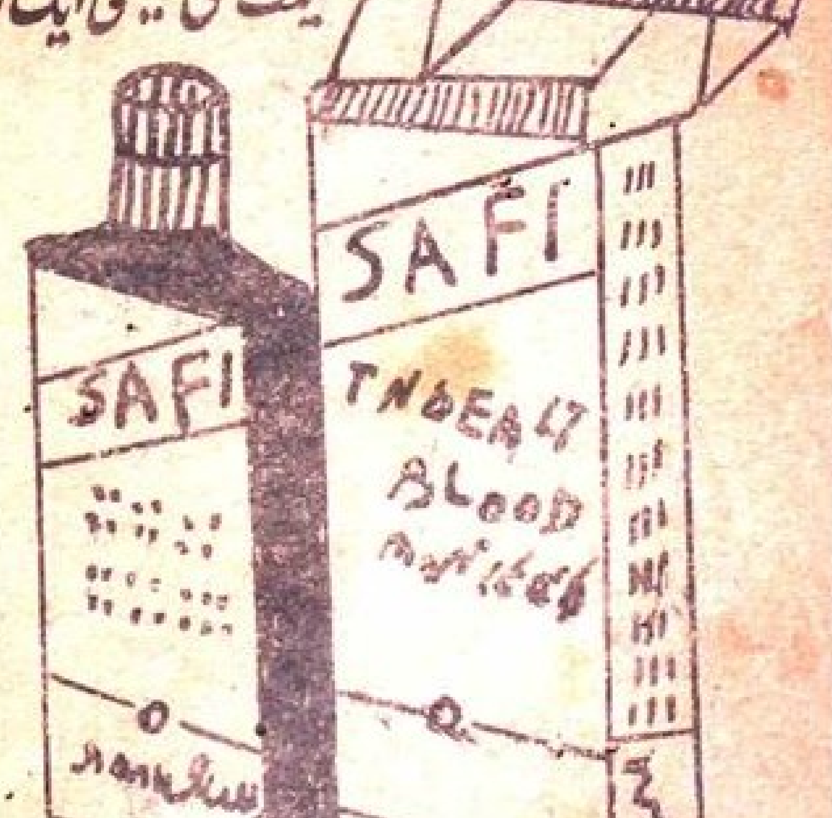

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا